مطالعاتی مواد

مضمون اردو

جماعت گیارھویں

حصہ نثر

ماہرین:

۱۔	شاکر شفیع	لیکچرر ہائر اسکنڈری اسکول مجہ گنڈ سرینگر
۲۔	روف راحت	لیکچرر ہائر اسکنڈری اسکول ہردشورہ بارہمولہ
۳۔	ڈاکٹر شکیل شفائی	لیکچرر ہائر اسکنڈری اسکول ایم پی ایم ایل باغِ دلاور خان سرینگر
۴۔	میر ساجد رمضان	لیکچرر ڈسٹرکٹ انسٹیچوٹ آف ایجوکیشنل ٹریننگس اننت ناگ
۵،	ڈاکٹر سید شبیر احمد	لیکچرر ڈسٹرکٹ انسٹیچوٹ آف ایجوکیشنل ٹریننگس بیروہ بڈگام
۶۔	ریاض خاکی	لیکچرر ہائر اسکنڈری اسکول نارہ پورہ شوپیاں

نگراں :

رابعہ نسیم مغل ریسرچ آفیسر ایس آئی سرینگر

معاون نگراں :

جاوید کرمانی ماسٹر ایس آئی ای سرینگر

تیار کردہ ؛

اسٹیٹ انسٹیچوٹ آف ایجوکیشن سرینگر کشمیر

زیر سرپرستی ؛

ڈیریکٹر اسکول ایجوکیشن کشمیر

اُردو زبان کا تاریخی جائزہ

تمہید:

اُردو زبان ہندوستان کی ایک جدید اور مقبول زبان ہے، اس کا تعلق ہند آریائی سے ہے، دوستور ہند کی آٹھویں شیڈول میں اُردو زبان بھی شامل ہے۔ ہندوستان میں مختلف زمانوں میں مختلف قومیں آئیں اور یہاں رچ بس گئیں۔ آریوں سے قبل آسٹرک اور دراویدی (دراوڑ) اس سرزمین کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ ان کی اپنی زبانیں تھیں اور رہن سہن کے اپنے طریقے۔ ۱۵۰۰ ق۔م میں آریا ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ ایک نئی زبان اور نئی تہذیب لائے۔ گزشتہ ساڑھے تین ہزار سال کے درمیان آریائی زبان ارتقاء کے مختلف مراحل سے گزری اور بہت سی شاخیں اُس سے پھوٹیں۔ اس طرح متعدد نئی زبانیں وجود میں آگئیں۔ آریائی زبان کے اس سفر کو ہم ''ہند آریائی کے ارتقاء'' سے تعبیر کرتے ہیں اور اس دور کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے اُن کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ۱۰۰۰ء کے بعد ہند آریائی زبانوں کے سفر کو ''ہند آریائی کا عہد جدید'' قرار دیا گیا ہے۔ ہندی، اُردو اور دوسری آریائی زبانوں کا تعلق ہند آریائی کے عہد جدید سے ہے۔ اس لیے انہیں جدید ہند آریائی زبانیں کہتے ہیں۔

اُردو کے آغاز کے بارے میں ہمارے بعض قدیم ادیبوں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن کی بنا محض قیاس آرائی پر ہے۔ اُردو کے آغاز سے متعلق کئی ایسے نظریے بھی پیش کئے گئے ہیں جن کی بنیاد ٹھوس دلائل اور شواہد پر ہے۔

اس اکائی میں ہم یہ جانیں گے کہ آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں کون سی قومیں آباد تھیں۔ ہند آریائی زبانوں کے مختلف ادوار کا جائزہ لیں گے۔ اُردو کی جائے پیدائش کے حوالے سے مختلف نظریات کا جائزہ لیں گے اور اُردو کی پیدائش کے حوالے سے سب زیادہ قابلِ قبول نظریے کی وضاحت کریں گے۔

مقاصد:

۱۔ ہندوستان میں ہند آریائی کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ اُردو کے اولین مسکن کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۳۔ لسانی اعتبار سے اُردو کا تعلق کس زبان سے ہے بتایا گیا ہے۔

۴۔ اُردو کے بارے میں مختلف نظریات کی وضاحت کی گئی ہے۔

آموزشی ماحصل :

۱۔ طلباء ہند آریائی کے مختلف ادوار کی جانکاری رکھتے ہیں۔

۲۔ طلباء اُردو لفظ کے لغوی معنی جانتے ہیں۔

۳۔ طلباء کو اُردو زبان کے تاریخی ارتقاء کے بارے میں بات کرتے ہیں

۴۔ طلباء اُردو زبان کی پیداش کے حوالے سے مختلف نظریات بیان کرتے ہیں۔

۵۔ طلباء اُردو زبان کی پیدائش سے متعلق پروفیسر مسعود حسین خان کے نظریئے کی وضاحت کرتے ہیں۔

ھند آریائی کے مختلف ادوار:

ہندوستان میں آریوں کے مختلف ارتقائی مراحل کو ''ہند آریائی'' کے ارتقاء سے موسوم کیا گیا ہے۔اس کا آغاز ۱۵۰۰ق۔م سے ہوتا ہے۔ ہند آریائی کا دورِاول (عہدقدیم)۱۵۰۰ق۔م تک پھیلا ہوا ہے۔

ہندوستان میں آریوں کی آمد سے قبل مختلف قومیں آئیں۔ان ہی میں سے ایک نیگریٹو(Nigrito) قبائل بھی تھے۔ان کے بعد آسٹرک (Austric) آئے اور ہندوستان میں آباد ہوئے۔آسٹرک کے بعد دراویدی (دراوڑ) آئے۔دراویدی شہری زندگی کے عادی تھے۔انہیں ایک مہذب قوم کی حیثیت حاصل تھی۔دراویدوں کے بعد آریا آئے۔آریوں نے دراویدوں کو شکست دے کر شمالی ہندوستان کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔جدید محققین کا خیال ہے کہ آریا اصلاً وسطی ایشیا کے باشندے تھے۔دراویدیوں کو شکست ہوئی اور وہ ملک کے جنوبی حصے میں سمٹ گئے۔

ہندوستان میں آریوں کے مختلف ارتقائی مراحل کو ''ہند آریائی'' کے ارتقاء سے موسوم کیا گیا ہے۔اس کا آغاز ۱۵۰۰ق۔م سے ہوتا ہے۔ ہند آریائی کا دورِاول (عہدقدیم)۱۵۰۰ق۔م تک پھیلا ہوا ہے۔

ہند آریائی کا عہدِ قدیم ۱۵۰۰ق۔م سے شروع ہوتا ہے۔اس عہد میں سب سے پہلے وید مرتّب ہوئے۔وید مختلف زبانوں میں لکھے گئے اور کئی رشیوں نے ویدوں کی ترتیب میں حصہ لیا۔رگ وید سب سے قدیم وید ہے۔اس طرح کل چار وید مرتب ہوئے۔ویدوں کی زبان کو ویدک زبان یا ویدک سنسکرت کا نام دیا گیا۔ویدک سنسکرت کے بعد کلاسیکی سنسکرت سامنے آتی ہے۔

ہند آریائی کا عہدِ وسطیٰ ۵۰۰ق۔م کے بعد شروع ہوتا ہے۔اس عہد میں پراکرتیں وجود میں آتی ہے اور پروان چڑھتی ہیں۔سنسکرت اعلیٰ طبقے کی زبان بن چکی تھی۔چنانچہ عوام میں پراکرت روز بروز مقبول ہوتی چلی گئی۔پراکرت ملک کے مختلف خطوں میں اپنے قدم جما چکی تھی۔ماہر لسانیات نے پانچ پراکرتوں کی نشاندہی کی ہیں جو اسطرح سے ہیں:

ا۔شورسینی ۲۔مہاراشٹری ۳۔ماگدھی ۴۔اردماگدھی ۵۔پشاچی

ہندآئی کا جدید دور ۱۰۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔پراکرت کو ادبی حیثیت حاصل ہوئی تو بول چال کی سطح پر عوام میں اَپ بھرنشیں رائج ہوئی۔ملک کے مختلف حصوں میں رائج اپ بھرنشوں کے نام حسبِ ذیل ہیں:

ا۔شورسینی اَپ بھرنش ۲۔مہاراشٹری اَپ بھرنش ۳۔ماگدھی اَپ بھرنش

۴۔اردھ ماگدھی اَپ بھرنش ۵۔براچڑ اَپ بھرنش

ان ہی اَپ بھرنشوں سے موجودہ جدید ہند آریائی زبانیں،اُردو، ہندی، بنگالی، اسامی، اُڑیا وغیرہ وجود میں آئیں۔

مختلف ادوار میں اُردو کے مختلف ناموں کی تفصیلات:

لفظ'' اُردو'' ترکی زبان سے سفر کرتا ہوا ہندوستان کی سرزمین میں پہنچا۔ترکی زبان میں اُردو کے معنی لشکر یا فوج کے جتھے کے ہوتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد اُردو کو ایک زبان کی حیثیت سے استعمال کرنے کا رواج عام ہوا۔اس سے پہلے ہر دور میں ہر علاقہ کے لوگ اس زبان کو بولی کی حیثیت سے مختلف ناموں سے یاد کرتے رہے ہیں۔تیرہویں صدی عیسوی میں جب حضرت امیر خسرو اور ان کی شعر گوئی کو شہرت حاصل ہوئی تو یہ زبان ہندوی کہلائی۔ ۱۳۲۷ء میں جب پایۂ تخت کی تبدیلی عمل میں آئی اور محمد بن تغلق نے دیوگری کو پایۂ تخت قرار دے کر دولت آباد نام رکھا اور ۱۴۰۰ء پالکیوں کے ذریعہ علماء اور صوفیاء کے قافلے دکن کے علاقہ میں پہنچے تو ان کے ذریعہ دکن کے علاقہ میں پھیلنے والی اس نئی زبان کو کبھی گجری کے نام سے یاد کیا

گیا اور کبھی یہ دکنی کہلاتی رہی۔ جب دہلی میں انگریزوں کی عملداری ہوئی اور اُردو مصنفین کی انگریزوں نے سرپرستی کی تو اُردو کے ادیبوں نے اس زبان کو دہلوی کے نام سے یاد کیا۔ اُردو شاعری کو طویل عرصہ تک ریختی کے نام سے یاد کیا جاتا رہا۔ انگریزوں نے اس زبان کو ہندوستانی کا نام دیا اور دلی کے شاہی حلقوں میں یہ اُردوئے معلیٰ کے نام سے یاد کی جاتی رہی۔ غرض مختلف ادوار میں مختلف علاقوں کے باشندوں نے اپنے اپنے علاقہ اور اس کی ضرورتوں کے اعتبار سے اس کے نام مقرر کیے۔ مرزا اسداللہ خاں غالب کی تحریروں اور اس کے بعد سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کے توسط سے ہندوستان میں ہر وقت مختلف ناموں سے یاد کی جانے والی زبان کو اُردو کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اِس حقیقت کا انکشاف بھی کیا ہے کہ سب سے پہلے لفظ اُردو کا استعمال دہلی کے مشہور شاعر میر محمدی مائل دہلوی نے اپنے دیوان میں کیا، جو قیام الدین قائم چاند پوری کے شاگرد تھے۔ اُردو زبان کا لفظ سب سے پہلے ۱۷۶۲ء میں استعمال ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

اُردو زبان کی جائے پیدائش کے بارے میں مختلف نظریات:

اُردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اس کا آغاز بھی باقی جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح ۱۰۰۰ء کے بعد ہی ہوا ہے۔ یہ اپنی ساخت اور لفظی سرمائے کے اعتبار سے ایک خالص ہند آریائی زبان ہے۔ مگر دوسری ہند آریائی زبانوں کی نسبت اس پر فارسی اور عربی زبانوں کے زیادہ گہرے اثرات ہیں۔ اسی وجہ سے کچھ ماہرین نے اس کا تعلق ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے جوڑا ہے۔ جو کہ بالکل غلط ہے۔

اُردو کے آغاز پر غور کرنے والوں کو دو خاص زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جماعت ہے جنہوں نے علمِ لسانیات کے اصولوں سے واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے محض اپنے قیاس کی بُنیاد پر کچھ نظریات قائم کیے۔ دوسرا گروہ ان ماہرین کا ہے جو علم لسانیات کی روشنی میں اُردو کی ابتداء سے متعلق اپنا ایک نظریہ ٹھوس شواہد اور حقائق پر قائم کرتے ہیں۔

قیاس پر اپنے نظریئے کی بنیاد رکھنے والے بزرگوں میں میر امن دہلوی، محمد حسین آزاد، نصیر الدین ہاشمی، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیرانی اور آمنہ خاتون وغیرہ شامل ہیں۔ جب کہ علم لسانیات کے بنیادی اصولوں پر اپنے نظریات قائم کرنے والوں میں محی الدین قادری زورؔ، مسعود حسین خان، شوکت سبزواری، سہیل بخاری اور گیان چند جین وغیرہ شامل ہیں۔ اُردو زبان کے آغاز سے متعلق مختلف نظریات کا خاکہ ماہرین کے حوالوں کے ساتھ درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	شخصیت	نظریئے	حوالہ
۱	میر امنؔ دہلوی	اکبر کے زمانے میں شاہ جہاں آباد (دہلی) میں پیدا ہوئی۔	باغ و بہار (ترجمہ)
۲	سید سلیمان ندوی	سندھ میں عربوں کی آمد کی وجہ سے	نقوشِ سلیمانی
۳	نصیر الدین ہاشمی	دکن میں عربوں کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے دکن میں پیدا ہوئی۔	دکن میں اُردو
۴	ڈاکٹر آمنہ خاتون	دکن میں دار الخلافہ کی تبدیلی کی وجہ سے	-
۵	محمد حُسین آزادؔ	برج بھاشا سے نکلی ہے	آبِ حیات
٦	حافظ محمود شیرانی	پنجاب سے مسلمان اپنے ساتھ دہلی لے گئے۔	پنجاب میں اُردو

۷	پروفیسر مسعود حسین خان	دہلی اور اسکے آس پاس پیدا ہوئی۔	مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو
۸	شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری	اُردو کی بنیاد کھڑی بولی پر ہے۔	۔
۹	گیان چند جین	اُردو، ہندی اور کھڑی بولی ایک ہیں۔	حقائق
۱۰	ڈاکٹر گریرسن	اُردو کا تعلق مغربی ہندی سے	Linguistic Survey of India

اُردو زبان کی ابتداء اور اس کے ارتقائی اور تاریخی سفر کے متعلق اگر چہ ماہرین میں اختلاف باقی ہیں تاہم یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ یہ زبان ایک خالص ہندوستانی زبان ہے اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی پیداوار ہے۔اس نے ہمیشہ ہندوستان کی سماجی، سیاسی، ادبی اور تہذیبی ترقی میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔یہ ایک زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے آج بھی باقی ہے اور اس کا مستقبل شاندار ہے۔

اُردو کے آغاز سے متعلق پروفیسر مسعود حسین خان کا نظریہ:

اُردو زبان کی ابتداء سے متعلق کئی ادیبوں، محققین اور ماہر لسانیات نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔جیسے میر امّن دہلوی نے ''باغ و بہار'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اُردو زبان اکبر شاہ کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی اختلاط سے پیدا ہوئی ہے۔سید سلیمان ندوی کے مطابق یہ سندھ میں عربوں کی آمد کا نتیجہ ہے۔نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر آمنہ خاتون کے نظریئے میں اس کی پیدائش دکن میں ہوئی ہے۔محمد حسین آزاد بتاتے ہیں کہ یہ برج بھاشا سے نکلی ہے۔حافظ محمود شیرانی اس کا رشتہ پنجاب اور پنجابی زبان سے جوڑتے ہیں۔ڈاکٹر سُہیل بخاری اور شوکت سبزواری اُردو کی بنیاد کھڑی بولی پر قرار دیتے ہیں۔یہ نظریات اگر چہ کافی چھان بین کے بعد اور بہت سارے دلائل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں لیکن ان سارے نظریات کی ماہرِ لسانیات نے لسانیات کے اصولوں پر کھرا نہ اُترنے کی وجہ سے اور تاریخی اعتبار سے صحیح نہ ہونے کی وجہ سے تنقید کی ہے۔یہ نظریات اگر چہ وقتی طور پر کافی مقبول بھی رہے مگر حقائق کی روشنی میں ان کی اہمیت کم ہوتی گئی اور بالآخر یہ نظریات رد کئے گئے۔

لسانیات کے اصولوں کے مطابق اور تاریخی اعتبار سے صحیح نظریہ پروفیسر مسعود حسین خان کا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب ''مقدمہ تاریخ زبان اُردو'' کے تیسرے باب میں اُردو کے ارتقاء کا تحقیقی مواد شامل کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔پروفیسر مسعود حسین خان نے اُردو کی ابتداء کے سلسلے میں دلی کے آس پاس والی بولیوں کو خاص اہمیت دی ہے۔انہوں نے محمود شیرانی کے نظریے کو رد کیا ہے۔انہوں نے قدیم دکنی اُردو کی خصوصیات کو پنجابی زبان سے منسوب کرنے کے بجائے اسے دلی کی قدیم بولیوں میں تلاش کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ دلی کے اردگرد چار بولیاں بولی جاتیں تھیں۔یہ بولیاں ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی ہیں۔ہریانی اور کھڑی بولی ''الف'' کو ترجیح دینے والی بولیاں ہیں۔

لسانی تحقیق کے ذریعہ پروفیسر مسعود حسین نے ڈاکٹر گریرسن کے نظریہ کی حمایت کرتے ہوئے لسانی پسِ منظر میں یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو کا علامت مصدر ''نا'' ہے جس کی وجہ سے اردو مصادر آنا، جانا، کھانا، پینا، لکھنا وغیرہ اُردو کے بنیادی مصادر کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔یہ مصادر ہندی الفاظ کے اصلی مصادر قرار دیے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ دوسری زبانوں سے اُردو میں فروغ پانے والے مصادر دورکنی الفاظ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

قدیم اُردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔جب کہ جدید اُردو کی بنیاد کھڑی بولی پر ہے۔پروفیسر مسعود حسین خان کا خیال ہے کہ حافظ محمود شیرانی نے دلی کی ان بولیوں کے اختلاف پر غور نہیں کیا ہے۔ہریانی کے اثرات کو انہوں نے پنجابی سے منسوب کیا ہے۔اس لئے کہ ہریانی پنجابی

کی ایک بولی تھی، ظاہر ہے دونوں میں گہری لسانی مماثلت ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے ڈاکٹر گریرسن کے نظریہ سے نتیجہ اخذ کر کے مشہور ماہر لسانیات سنتی کمار چٹر جی کے خیالات سے استفادہ کے بعد اپنے حقیقی نظریے پیش کیا اور ان بولیوں پر غور کر کے اور ان کے قدیم تحریری مواد کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نواحِ دہلی کی یہ بولیاں اُردو کا اصلی سرچشمہ ہیں اور دہلی اُردو کی اصلی جائے پیدائش ہے۔

محاکمہ

اس اکائی کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اُردو زبان کی ابتداء سے متعلق کئی ادیبوں، محققین اور ماہر لسانیات نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ اُردو کے آغاز اور جائے پیدائش سے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ کبھی اس زبان کا تعلق برج بھاشا سے جوڑا گیا۔ کبھی سندھ کو اس زبان کی جائے پیدائش قرار دیا گیا۔ کبھی پنجاب کو اس کا مسکن کہا گیا اور کبھی دکن کو اس کی پیدائش کے ساتھ جوڑا گیا۔

لسانیات کے اصولوں کے مطابق اور تاریخی اعتبار سے صحیح نظریہ پروفیسر مسعود حسین خان کا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب ''مقدمہ تاریخ زبان اُردو'' میں پیش کیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے اُردو کی ابتداء کے سلسلے میں دلی کے آس پاس والی بولیوں کو خاص اہمیت دی ہے۔ اان کا خیال ہے کہ دلی کے اردگرد چار بولیاں بولی جاتیں تھیں۔ یہ بولیاں ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی ہیں۔ ہریانی اور کھڑی بولی ''الف'' کو ترجیح دینے والی بولیاں ہیں۔ قدیم اُردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ جب کہ جدید اُردو کی بنیاد کھڑی بولی پر ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان نے ان بولیوں پر غور کر کے اور ان کے قدیم تحریری مواد کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ نواحِ دہلی کی یہ بولیاں اُردو کا اصلی سرچشمہ ہیں اور دہلی اُردو کی اصلی جائے پیدائش ہے۔

جانچ:

۱۔ ہندوستان میں آسٹرک، دراوڑ اور آریوں کی آمد کے حوالے سے اپنے مطالعے کا خلاصہ پیش کیجئے۔

۲۔ ہند آریائی کے مختلف ادوار کا جائزہ لیجئے۔

۳۔ مسعود حسین خان نے کن بنیادوں پر محمود شیرانی سے اختلاف کیا ہے؟

۴۔ اُردو کے آغاز سے متعلق مسعود حسین خان کا نظریہ سپرد قلم کیجئے۔

۵۔ اُردو کو مختلف ادوار میں کون کون سے ناموں سے یاد کیا جاتا رہا؟

۶۔ لسانی پسِ منظر میں اُردو کا تعلق کس زبان سے ہے۔

معاون کتب:

۱۔	مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو	مسعود حسین خان
۲۔	پنجاب میں اُردو	محمود شیرانی
۳۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
۴۔	لسانی مطالعے	پروفیسر گیان چند جین
۵۔	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹر جی

حاتم کی سخاوت

داستان

تمہید :

مضمون ’’حاتم کی سخاوت‘‘ گیارھویں جماعت کی نصابی کتاب میں شامل ہے۔ یہ مضمون میر امّن دہلوی کی کتاب ’’باغ و بہار‘‘ سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب ’’باغ و بہار‘‘ میر امن نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں لکھی۔ باغ و بہار کا سنہ تصنیف ۱۸۰۱ء ہے۔ باغ و بہار کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے کلیم الدین احمد نے لکھا ہے ’’میر امن کی عبارت میں ایک خاص آہنگ ہے اور اس کے جملوں کی ساخت، ترتیب اور حرکت میں باریکی، تناسب اور جاذبیت ہے۔ مولوی عبدالحق نے باغ و بہار کی فصاحت و سلاست کے بارے میں کہا ہے ’’وہ اسی کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے کتاب کے کسی حصے میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اول سے آخر تک کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا ہر لفظ، ہر فقرہ، ہر ٹکڑا سلیس و فصیح ہے اور اس سلاست و فصاحت سے عبارت میں ایسی روانی پیدا ہوئی ہے کہ پڑھنے والا قصے کی دلچسپی سے قطع نظر خود اس کی روانی میں گم گشتگی سی محسوس کرتا ہے۔‘‘

ڈاکٹر سید عبداللہ باغ و بہار کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ’’باغ و بہار‘‘ اُردو کی زندہ نثر کی پہلی کتاب ہے‘‘

مقاصد:

۱۔ استاد بچوں کو داستان کی تعریف اور اس کے اجزاء ترکیبی سے واقف کرائے گا۔

۲۔ استاد ’’باغ و بہار‘‘ کی ادبی اہمیت بچوں کو سمجھائے گا۔

۳۔ ’’باغ و بہار‘‘ کی زبان اور عام دلی کی زبان کے علاوہ آج کل بولی جانے والی اُردو زبان کے الفاظ (مذکورہ سبق) سے بچوں کو واقف کرایا جائے گا۔

۴۔ میر امن کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں کے بارے میں بچوں کو جانکاری دی جائے گی۔

۵۔ استاد طلبہ کو سبق ’’حاتم کی سخاوت‘‘ کی تفہیم عبارت کرائے گا۔ اس کے علاوہ مشکل الفاظ کی مشق کرائے گا۔

آموزشی ماحصل:

۱۔ بچے باغ و بہار سے ماخوذ سبق ’’حاتم کی سخاوت‘‘ پڑھ سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں۔ وہ باغ و بہار کی زبان سے واقف ہوتے ہیں۔

۲۔ بچے داستان کے بارے میں جانکاری حاصل کر چکے ہیں۔ وہ داستان کے عناصر ترکیبی کے بارے میں جانتے ہیں۔

۳۔ طلبہ میر امن کے حالاتِ زندگی اور اس کے ادبی کارناموں سے واقف ہیں۔ وہ میر امن کے اسلوب سے واقف ہیں۔

۴۔ بچے سخاوت، نیک بختی اور نرم دلی جیسے اوصاف جیسے اوصاف اپنے اندر پیدا کر سکیں تاکہ دوسرے لوگ ان کی شخصیت کو پسند کریں اور ان کی شخصیت سے متاثر ہو جائیں۔

اس موضوع کی وضاحت اور تفصیل کیلئے مطالعہ کا مواد مندرجہ ذیل ذیلی عنوانات پر شامل ہوگا۔

۱۔ داستان اور عناصر ترکیبی

۲۔ باغ و بہار کی ادبی اہمیت

۳۔ سبق کا خلاصہ

۴۔ مشکل الفاظ کی مشق

۵۔ الف: میر امن کے حالاتِ زندگی اور

(ب) میر امن کے ادبی کارنامے

۶۔ جانچ

داستان:

داستان اُردو کے افسانوی ادب کی قدیم تر صنف ہے۔ افسانوی ادب سے مراد وہ ادب ہے جس میں کوئی قصہ یا کہانی یا کوئی واقعہ سوچنے کی طاقت (قوت متخیلہ) کے سہارے بیان کیا جائے۔ داستان، ناول، افسانہ سب کہانی کی مختلف شکلیں ہیں۔ داستان ان اصناف ادب میں اس لئے امتیازی خصوصیت رکھتی ہے کہ یہ تحریر سے زیادہ بیان کا فن ہے۔ اس کے موضوعات میں عشق اہم ترین ہے۔ ساری مہم جوئی کا مقصد محبوب سے وصل ہے۔ اس کے کردار، شہزادے، شہزادیاں، بادشاہ، وزیر اور فافوق الفطری جن پری، دیو وغیرہ ہوتے ہیں۔ پلاٹ پیچیدہ اور قصہ در قصہ ہوتا ہے۔ منظر نگاری بھی خوب ہوتی ہے۔ داستان کا اسلوب بھی لطیف اور فصیح ہوتا ہے۔ کبھی کبھی سادہ اور سلیس زبان بھی استعمال ہوتی ہے۔ اُردو کی داستانوں میں فسانۂ عجائب، بوستانِ خیال، داستانِ امیر حمزہ، نوطرز مرصع، باغ و بہار، آرائشِ محفل اور مذہب عشق شامل ہیں۔

داستان کے عناصر ترکیبی مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ طوالت: داستان کا فن اختصار کا نہیں طوالت کا فن ہے۔ داستان اس ماحول کی پیداوار ہے جہاں لوگوں کے پاس فرصت اور اطمینان کی افراط تھی۔ وقت گذارنے کے لئے رقص و سرور کے لئے داستان گوئی اور داستان سننا ہوتا تھا۔ داستان گوئی میں مختلف قصے باندھ کر ایک طویل قصہ بنایا جاتا تھا۔

۲۔ پلاٹ: داستان میں طوالت کے باعث ایک مربوط اور سادہ پلاٹ نہیں ہوتا بلکہ پیچیدہ پلاٹ ہوتا ہے۔ کیونکہ کہانی طویل ہونے کی وجہ سے سیدھا سادہ پلاٹ تو نہیں ہوتا بلکہ کہانی ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے اور پلاٹ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ کردار نگاری: ہر قصے کی بنیاد کرداروں پر ہوتی ہے۔ کرداروں کے اردگرد کہانی بنائی جاتی ہے۔ کردار ہی قصے کو آگے بڑھاتے ہیں اور کردار ہی قصہ میں نشیب و فراز پیدا کر دیتے ہیں۔

۴۔ مافوق الفطری عناصر: داستانوں میں عجیب و غریب مخلوق نظر آتی ہے۔ یہاں دیو، جن، پری، نجومی، جیوتشی اور جادوگر جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اس سے داستان میں حیرت انگیز فضا پیدا ہوتی ہے۔ ان عناصر کی وجہ سے داستان دلچسپ بنتی ہے۔

منظر نگاری: داستان میں بہت عمدہ قسم کی منظر نگاری ملتی ہے۔ ہندوستان کی سرزمین قدرتی مناظر سے مالا مال ہے۔ اونچے پہاڑ، سرسبز شاداب میدان باغات بھی ہیں۔ صحرا اور ریگستان بھی ہیں۔ صبح بنارس اور شام اودھ کا منظر بھی ہے۔ داستانوں میں ان سب کا عکس نظر آتا ہے۔

اسلوب: عموماً داستانوں میں دو اسلوب اختیار کیے گئے ہیں۔ ایک پر تکلف اور پرشکوہ انداز بیان اور دوسرا سلیس اور سادہ۔ پہلے میں نوطرز مرصع اور فسانۂ عجائب کو پیش کیا جاتا ہے اور دوسرے میں قصہ مہر افروز دلبر اور باغ و بہار کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ داستان میں اپنا مخصوص اسلوب بیان پایا جاتا ہے۔ داستان کا اسلوب لطافت زبان اور فصاحت بیان سے عبارت ہوتا ہے۔ داستانوں کا اسلوب ہی ان کی شناخت اور انفرادیت کا سبب بنتا ہے۔

باغ وبہار کی ادبی اہمیت:

باغ و بہار اُردو ادب میں ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب امیر خسرو کے فارسی قصے چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ میر امن نے یہ ترجمہ باغ و بہار کے نام سے ۱۸۰۳ء میں شائع کیا۔ جو آج تک مقبول عام ہی نہیں بلکہ دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کتاب کا انداز بیان اُردو کی سب داستانوں سے زیادہ دلکش اور دلنشین ہے۔ مولوی عبدالحق باغ و بہار کی دلکشی اور دل نشینی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ''اپنے وقت کی نہایت فصیح و سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔'' ا اس کتاب کا اسلوب بیان سیدھا اور سادہ ہے۔ میر امن نے نہایت ہی فنکارانہ انداز سے موقعہ اور محل کے مطابق ہندی کے مروجہ الفاظ استعمال کر کے زبان میں روانی اور نکھار پیدا کیا ہے۔ کہیں کہیں فارسی اور عربی کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ لیکن زبان کی روانی میں فرق نہیں آیا ہے۔

بہت سارے ادبا نے میر امن کی نثر سے متاثر ہو کر نثر تحریر کی جن میں مرزا غالب بھی اہم ہیں۔ بقول سید وقار عظیم:

''میر امن کے طرز بیان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کسی قصے کو جہاں سے چاہیے پڑھ لیجئے اس میں یہی سادگی، یہی روانی، یہی سلاست و فصاحت، یہی لطافت، حلاوت اور گھلاوٹ اور یہی وقار ملے گا۔''

میر امن کو جو قبول عام کا درجہ حاصل ہوا ہے وہ اس لئے ہے کہ انہوں نے داستان گو کی حیثیت سے تمام لوازمات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے منصب اور ذمہ داریوں کو روا رکھا ہے۔

سبق کا خلاصہ:

حاتم کے وقت عرب کا ایک بادشاہ نوفل نام کا تھا۔ اس کو حاتم کے ساتھ بہ سبب ناموری دشمنی ہوئی اور اس نے حاتم کے ملک پر چڑھائی کی۔ حاتم ایک خدا ترس اور نیک مرد تھا۔

وہ لڑائی نہیں چاہتا تھا کیونکہ بقول حاتم خوامخواہ لوگ مارے جائیں گے۔ اس لئے حاتم ایک پہاڑ کی غار میں چھپ گیا۔

ادھر نوفل نے اعلان کیا کہ جو حاتم کو ڈھونڈ کر لائے گا وہ پانچ سو اشرفی انعام پائے گا۔ یہ سن کر سب حاتم کی تلاش میں نکلے۔ اس دوران ایک بوڑھا اپنی بیوی بچوں کے ساتھ اس غار کے سامنے لکڑیاں چننے لگے جہاں حاتم چھپا تھا۔ بوڑھیا نے کہا اگر حاتم ہمارے ہاتھ لگے تو اس کام سے نجات ملتی اور یہ انعام کی رقم سے ہماری زندگی اچھی گذرتی۔ حاتم نے یہ باتیں سنی ان کی مدد کے لئے باہر آیا۔ بوڑھے اور بوڑھیا سے کہا مجھے نوفل کے پاس لے چلو اور انعام کی رقم سے اپنی زندگی اچھی طرح گذارو۔ بوڑھا بھی نیک آدمی تھا کہا کہ اگر نوفل تمہیں مار ڈالے گا تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اس بحث و مباحثہ میں اور بھی لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے حاتم کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لیا۔ کسی نے کہا میں نے ڈھونڈ کر لایا۔ کسی نے کہا میں نے۔ سب نے حاتم کو پکڑ کر لانے کا دعویٰ کیا اور بوڑھا خاموش رہا اور حاتم نے دیکھا کہ سب جھوٹ بول رہے ہیں تو ایک دم بادشاہ کو کہا مجھے وہ بوڑھا یہاں لایا۔ بوڑھے شخص نے بادشاہ کو سارا قصہ سچ سچ بتایا۔ سب کو سزا ملی۔ بادشاہ حاتم کی سخاوت اور بہادری کے بارے میں سن کر خوش ہوا۔ حاتم سے دوستی کی اور اس کو سب ملک اور مال واسباب واپس کر دیا جو ضبط کیا تھا اور قبیلہ طے کی سرداری حاتم کو دے دی اور بوڑھے کو پانچ سو اشرفیاں اپنے خزانے سے دلوادیں۔ وہ دعا دیتا ہوا چلا گیا۔

میر امن کے حالاتِ زندگی:

میر امان اللہ نام اور امن تخلص تھا۔ بعض نے ''لطف'' بھی تخلص بتایا ہے اور نام میر امن، باغ و بہار کے اختتام پر ان کا یہ شعر ہے۔

خدایا بہ حق رسولِ کبار   تو کونین میں لطف پر لطف رکھ

اس کے علاوہ گنج خوبی کے خطی نسخہ پر بھی میر امن لطف لکھا ہے۔

میر امن دہلی کے رہنے والے تھے۔ مغلیہ سلطنت میں ان کے آباؤ اجداد بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے دلی کو لوٹا اور قتل عام کا بازار گرم کیا۔ میر امن نے ان حالات سے دوچار ہوکر دلی سے عظیم آباد پٹنہ کی طرف کوچ کیا اور ناموافق حالات نے وہاں بھی نہ چھوڑا تو کلکتہ کی راہ لی۔ کچھ وقت بے روزگار رہے اور بعد میں نواب دلاور جنگ نے انہیں اپنے چھوٹے بھائی کا اتالیق مقرر کرلیا۔ لیکن طبیعت میں آسودگی نہ ہوسکی۔ اسی دوران منشی بہادر علی حسینی نے فورٹ ولیم کالج میں جان گلکرسٹ سے ان کی ملاقات کرائی۔ بالآخر مئی ۱۸۰۱ء میں کالج کے ہندوستانی شعبہ میں چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ پر بحیثیت منشی ان کا تقرر ہوا۔ پانچ سال ملازمت کے بعد ۱۸۰۶ء میں وہ سبکدوش ہوئے۔ بقیہ زندگی کے احوال پوری طرح معلوم نہیں۔ میر امن کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی اور کتنی ہوئی اس کے بارے میں پوری واقفیت نہیں ملتی البتہ فارسی زبان پر دسترس تھی کیونکہ ان کی کتاب ''گنج خوبی'' فارسی کی ایک کتاب ''اخلاق محسنی'' کا اُردو ترجمہ ہے۔

میر امن کے ادبی کارنامے:

اُردو ادب کی تاریخ میں میر امن کی شہرت کا راز باغ و بہار ہی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں جو اُدباء موجود تھے ان میں سب سے شہرت میر امن کو نصیب ہوئی۔ میر امن نے صرف دو کتابیں لکھیں۔ لیکن ادب میں باغ و بہار ہی اُن کی بقا کی ضامن ہے۔ اس کتاب کو اُنھوں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء میں نوطرز مرصع سے ترجمہ کیا۔ اُردو زبان و ادب میں باغ و بہار کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب زندہ کتاب کہلانے کی حقدار ہے۔ دراصل باغ و بہار کی اہمیت صرف داستان یا دلچسپ کہانی اور اس کے موضوع کی بنا پر نہیں بلکہ اسلوب، طرزِ تحریر اور زبان و بیان کی وجہ سے ہے۔ اس وقت کی مروجہ نثر سے ہٹ کر عام فہم، سادہ، سلیس اور بامحاورہ نثر کی بنیاد میر امن نے باغ و بہار کی صورت میں ڈال دی ہے۔ میر امن کو دلی اور اس کی تہذیب سے جذباتی عقیدت ہے۔ یہی چیز باغ و بہار میں آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ یعنی وہی بامحاورہ اور ٹکسالی زباں، وہاں کی تہذیب، میلے ٹھیلے۔ سیر تماشے، تقریبات، ضیافتیں، رسوم، عقائد اور آداب و مراسم غرض چلتی پھرتی زندگی کی تصویر میر امن نے شاید یہ سوچ کر اس کا نام رکھا ہو کہ ہمیشہ یہ باغ و بہار رہے۔

میر امن کی تحریر اس قدر سادہ، صاف اور بامحاورہ ہے کہ سرسید مرحوم ان کو اُردو نثر میں وہی درجہ دیتے ہیں جو میر تقی میر کو نظم میں حاصل ہے۔ باغ و بہار کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں بھی ہوچکا ہے۔ اُردو زبان میں تو اس کے بے شمار ایڈیشن طبع ہوئے ہیں۔ اُردو نثر کے ارتقاء میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اُردو نثر نگاری کے میدان میں یہ سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم دقیق طرز تحریر کا خاتمہ اور سادہ، صاف اسلوب بیان کا آغاز اسی کتاب سے ہوا۔

جانچ:

حصہ (الف) مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھو:

۱۔ داستان کی تعریف کرو۔

۲۔ داستان کے عناصر ترکیبی لکھو۔

۳۔ باغ و بہار کی ادبی اہمیت پر پانچ جملے لکھو۔

حصہ (ب) مختصر جوابات لکھو:

۱۔ حاتم کون تھا؟

۲۔ ’’حاتم کی سخاوت‘‘ کس کتاب سے ماخوذ ہے؟

۳۔ ’’باغ بہار‘‘ کس نے لکھی ہے اور کب؟

۴۔ ’’باغ و بہار‘‘ اُردو کی زندہ نثر کی پہلی کتاب ہے کس کا جملہ ہے؟

حصہ (د) مندرجہ ذیل اقتباس کو غور سے پڑھ کر آخر میں دیے گئے سوالات کے جوابات لکھئے۔

ایک روز ایک بوڑھا اور اس کی بوڑھیا، دو تین بچے چھوٹے چھوٹے لیے ہوئے، لکڑیاں توڑنے کے واسطے اُس غار کے پاس جہاں حاتم پوشیدہ تھا پہنچے اور لکڑیاں اس جنگل سے چننے لگے۔ بڑھیا بولی کہ ’’اگر ہمارے دن کچھ بھلے آتے تو حاتم کو کہیں ہم دیکھ پاتے اور اس کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے جاتے تو وہ پان سو اشرفی دیتا اور ہم آرام سے کھاتے۔ اس دُکھ دھندے سے چھوٹ جاتے۔‘‘

سوال نمبر ۱: بوڑھا اور بوڑھیا جنگل میں کیا کر رہے تھے؟

سوال نمبر ۲: بوڑھا اور بوڑھیا کہاں تھے؟

سوال نمبر ۳: بوڑھیا نے کیا خواہش ظاہر کی؟

سوال نمبر ۴: حاتم کہاں چھپا تھا؟

فورٹ ولیم کالج

تعارف :

اردو ادب کی ترقی اور ترویج میں جن اداروں نے قابلِ تحسین کام انجام دیا ہے اُن اداروں میں فورٹ ولیم کالج کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اس کالج کا قیام اگرچہ انگریزوں نے ذاتی مقاصد کے لئے کیا تھا لیکن اس نے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ اس کالج کی وساطت سے اردو مشینی دور میں داخل ہوئی اور اردو میں ترجمے کا کام بڑے پیمانے پر ہوا۔ سادہ اور سلیس نثر لکھنے کی روایت بھی اسی کالج میں شروع ہوئی۔ اس کالج نے پہلی بار اردو ادیبوں کو ایک جگہ پر کام کرنے کے لئے پلیٹ فارم فراہم کیا۔

مقاصد :

۱۔ طلاب کو فورٹ ولیم کالج کے بارے میں معلومات فراہم کرنا۔

۲۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کی جانکاری دینا۔

۳۔ میر امن اور باغ و بہار کے اسلوب اور اس کی ادبی اہمیت کا جائزہ لینا۔

آموزشی ماحصل:

۱۔ طلاب فورٹ ولیم کالج کی تاریخ کے بارے میں مضامین لکھتے ہیں۔

۲۔ طلاب فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کے متعلق گفتگو اور مذاکرہ کرتے ہیں۔

۳۔ طلاب میر امّن کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر تبصرہ کرتے ہیں۔

۴۔ طلاب باغ و بہار کی ادبی اہمیت اور اس کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

موضوع کی تفصیل :

پسِ منظر:

انگریز سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں وارد ہند ہوئے ۔ اگر چہ یہ لوگ ہندوستان تجارت کی غرض سے آئے تھے مگر ہندوستان کے متعلق ان کے عزائم ٹھیک نہیں تھے۔اصل میں ان کے یہاں آنے کا مقصد برطانوی سامراج کا پھیلاو تھا۔ پہلے گجرات اور بعد میں بنگال میں انہوں نے اپنی تجارتی منڈیاں قائم کیں۔ بنگال میں کمپنی انگریزوں نے قائم کی اس کا نام ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' رکھا گیا۔ جب کمپنی کولکتہ میں مستحکم ہوئی تو اس نے بنگال کے سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کی، جس کی وجہ سے بنگال کے نوابوں اور کمپنی کے درمیاں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی اور کئی بار یہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آگئے یہاں تک کہ 1750ء میں پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ اور کمپنی کے فوجوں کے درمیان خونریز جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں نواب سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور بنگال انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔ ''نفاق ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو عملاتے ہوئے انگریز ایک ایک کر کے ہندوستان کے مختلف صوبوں پر حکومت جماتے گئے اور کرتے کرتے شمال مشرقی ہندوستان سے نکل کر انگریز جنوبی ہندوستان کے کئی ریاستوں پر بھی قابض ہوئے۔ 1799ء میں ٹیپو سلطان کو ہرا کر میسور بھی انہوں نے ہڑپ لیا۔

1798ء میں جب لارڈ ویلزلی ہندوستان کے گورنر جنرل بن کر آئے تو انہوں نے یہ سفارش کی تھی کہ ہندوستان میں انگریز حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کی زبانیں سیکھی جائیں تاکہ حکومت چلانے میں آسانی ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک یہ بھی سفارش کی تھی کہ نو وارد انگریز افسروں کی یہاں کی زبانیں سکھانے کے لئے ایک کالج قائم کیا جائے۔ اسی سفارش کے بناء پر انگریز حکومت نے 10 جولائی 1800ء کو کولکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔

کالج کا ارتقاء:

فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو کی ارتقائی تاریخ میں میل کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کالج 10 جولائی 1800ء کو کلکتہ میں قائم دریائے ہگلی کے کنارے پر قائم کیا گیا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کا یومِ تاسیس 23 مئی کو منایا جایا گا۔ یہ تاریخ دکن میں انگریز سامراج کے سب سے بڑے مخالف ٹیپو سلطان پر انگریزوں کی فتح کا دن تھا۔ ڈاکٹر رابرٹ برون کالج کے پہلے پرنسپل مقرر کئے گئے ۔ چونکہ اردو اُس وقت ہندوستان میں رابطے کی سب سے بڑی زبان تھی اس لئے کالج میں اردو کا ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا۔ اس زبان کی قسمت کا ستارہ عروج کی اور رواں دواں تھا کہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو اس شعبے کا صدر مقرر کیا گیا۔ گلکرسٹ ایک زبان داں، ایک دانشور اور ماہرِ تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے دلدادہ تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں

''جس گاؤں اور جس شہر سے میرا گذر ہوا وہاں اس زبان کی مقبولیت کی جو میں سیکھ رہا تھا شہادتیں ملیں''۔

گلکرسٹ کی ذاتی کوششوں اور اردو میں اُن کی دلچسپی کی وجہ سے اس شعبے نے بہت کام کیا۔ اب کالج میں انگریز افسروں کو اردو زبان پڑھانے کا مسئلہ درپیش آیا۔ اس زبان میں نہ ہی پڑھنے کے لئے کتابیں میسر تھی اور نہ ہی پڑھانے کے لئے استاد۔ گلکرسٹ نے ہندستان کے مختلف حصوں سے اردو کے اہلِ قلم حضرات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کالج میں جمع کیا۔ ان حضرات کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی سونپا گیا۔ دوسری زبانوں کی مشہور کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا عمل بھی شروع ہوا۔ زبانیں سکھانے کے علاوہ اس کالج میں ایک کُتب خانہ اور چھاپہ خانے کا بھی انتظام موجود تھا۔ درجنوں کتابیں اس کالج میں تیار ہوئی اور اردو زبان میں انقلابی نوعیت کی تبدیلی رونما ہوئی۔ یہ سب گلکرسٹ کی بدولت ممکن ہوا۔ بابائے اردو

مولوی عبدالحق نے جان گلکرسٹ کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا ہے:

''بلا مقابلہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان اردو شاعری پر ولی نے کیا تھا اس سے زیادہ اسی قدر احسان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے''

پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ کالج کے قیام کا خالص مقصد برطانیہ سے ہندوستان آنے والے انگریز افسروں کو ہندوستانی زبانیں سکھانی تھیں لیکن اس کالج نے انگریزوں سے زیادہ اردو زبان کی خدمت کی۔ اس کالج میں ۱۹ اہلِ قلم حضرات نے تقریباً ساٹھ کے قریب کتابیں اردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ جبکہ ڈاکٹر سمیع اللہ اپنی کتاب فورٹ ولیم کالج ایک مطالعہ میں ان کتابوں کی تعداد سو سے زیادہ بتاتے ہیں۔ پیش ہے اس کالج کی خدمات کا ایک جائزہ:

۱۔ اس کالج نے اردو میں ترجمہ نگاری کی باقاعدہ روایت کو فروغ دیا۔

۲۔ اس کالج سے اردو کتابیں پریس پر شائع ہونے لگی یعنی اردو مشینی دور میں داخل ہوئی۔

۳۔ اس نے کالج نے اردو ادیبوں کو ایک جگہ مل کر اردو کی خدمت کرنے کا موقعہ میسر کیا۔

۴۔ اس کالج نے پہلی بار اردو زبان کو باقاعدہ روزگار کے ساتھ جوڑ دیا۔

۵۔ اس کالج نے اردو میں سادہ، سلیس اور عام فہم نثر کی روایت شروع کی اور اردو ادب کو ''باغ و بہار'' جیسی لازوال تصنیف اور میر امن جیسے ادیب عطا کیے۔

۶۔ اس کالج نے اردو کو ہندوستان کی سرحدوں سے آگے لے جانے کا کام شروع کیا۔

۷۔ اس کالج میں داستانوں کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں گیئں۔

فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین اور اُن کی اہم تصنیفات:

مصنف	تصنیف
میر امن دہلوی	باغ و بہار
میر شیر علی افسوس	باغِ اردو
حیدر بخش حیدری	آرائشِ محفل، گلزارِ دانش، گلشنِ ہند (شعرائے اردو کا تذکرہ)
مظہر علی خاں ولا	سنت گلشن، تاریخِ شیر شاہی
میر بہادر علی حسینی	اخلاقِ ہندی
مرزا علی لطف	تذکرہ گلشنِ ہند
مرزا کاظم علی جواں	شکنتلا (ڈرامہ)
خلیل خاں اشک	داستانِ امیر حمزہ
نہال چند لاہوری	مذہبِ عشق
بنی نرائن جہاں	دیوانِ جہاں (اردو شعراء کا تذکرہ)
للولال جی	سنگھاسن بتیسی

کالج کازوال؛

کالج کا شعبۂ اردو تب تک سرعت سے کام کرتا رہا جب تک جان گلکرسٹ اس کے سربراہ رہے۔ جب گلکرسٹ کو لگا کہ وہ اپنے منصوبے کے مطابق کالج میں کام نہیں کر پا رہے ہیں تو انہوں نے کالج سے مستعفیٰ ہونے کا اعلان کیا۔ آخرکار 23 مئی 1808ء کو باقاعدہ طور پر استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد اردو شعبہ بے توجہی کا شکار ہو گیا۔ 1820ء میں کالج کے بورڈ آف ڈیریکٹرس نے کالج کی رقم گھٹا دی جس سے پورا کالج متاثر ہوا۔ اس کے بعد یہ کالج انگریزوں کی عدم توجہی سے آہستہ آہستہ زوال کا شکار ہوا اور 1854ء میں اس کے باقاعدہ بند ہونے کا اعلان نامہ نکالا گیا۔ اپنے بیس سال کے سرگرم اور پھر چونتیس سال کے ہلکے پھلکے سفر کے دوران اس کالج نے اردو زبان کو زمین سے اُٹھا کر نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اردو نثر کے دامن کو وسیع کیا اور زبان کو عبارت آرائی، قافیہ بندی اور تک بندی سے نجات دلائی۔ اس کالج کی دین کا اعتراف کرتے ہوئے علی احمد فاطمی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''فورٹ ولیم کالج کی عمر بہت زیادہ نہیں رہی۔ صرف پندرہ سال میں ہی اس نے ایسے کارنامے انجام دئے جو اردو دُنیا میں ناقابلِ فراموش ہیں''۔

محاکمہ:

فورٹ ولیم کالج کے پسِ منظر، اس کے ارتقاء، اس کی خدمات اور اس کے زوال کے بارے اس مضمون میں تفصیل کے بات ہوئی۔ اتنا طے ہے کہ یہ شمالی ہندوستان میں پہلا غیر ملکی ادارہ تھا جس نے اپنے ملک سے زیادہ ہندوستانی زبان و ادب کی خدمت کی۔ اگرچہ یہ کالج ایک سیاسی منصوبے کے تحت اس لئے قائم کیا گیا تھا کہ انگریز افسران ہندوستانی زبانیں سیکھ کر یہاں کے عوام کے مزاج اور یہاں کی ثقافت کے بارے میں آگہی حاصل کر کے حکومت کو مستحکم کریں۔ لیکن اس کالج نے ان منصوبوں سے زیادہ یہاں کی زبانوں کی خدمت کی خاص طور پر اردو زبان کی۔ اس کالج میں پہلی بار ٹائپ اور پرنٹنگ پریس کا استعمال ہوا، جس سے یہاں کی زبانیں عروج کی اور گامزن ہوئی۔ اردو میں سادہ، سلیس اور عوامی نثر لکھنے کا رواج ہوا اور نثر کو سجاوٹ، قافیہ پیمائی اور ژولیدگی سے نجات ملی۔ اردو زبان اس کالج کی مرہونِ منت ہے۔

جانچ :

۱۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد بیان کیجئے؛

۲۔ کالج کے شعبۂ اردو کے بارے میں اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے:

۳۔ جان گلکرسٹ کے بارے میں آپ نے کیا جانا؟

۴۔ کالج نے اردو زبان کی کیا خدمت انجام دی؟

۵۔ کالج کا زوال کیوں ہوا؟

کتابیات

۱۔	تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی
۲	ای۔ گیان کوش Egiyankosh	انٹرنیٹ(website)
۳۔	فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات	ڈاکٹر عبیدہ بیگم
۴۔	آزاد دائرۃ المعارف	انٹرنیٹ(website)
۵۔	فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور اُن کی تصانیف	یوٹیوب(youtube)
۶۔	ہماری داستانیں	سید وقار عظیم
۸۔	وجہی سے عبدالحق تک	مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ

ایک کہانی

مرزا فرحت اللہ بیگ

تمہید:

مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا مضمون ''ایک کہانی''، تمثیلی انداز میں لکھا گیا ہے۔اس مضمون کا بنیادی مقصد اچھے مزاج اور بُرے مزاج والے لوگ ہیں۔اچھے لوگوں کو اچھا ہی ملتا ہے اور بُرے لوگوں کو بُرا ہی ملتا ہے۔اس کہانی میں تین موسم جاڑا، گرمی اور برسات کو انسانوں کے کرداروں میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ دو بوڑھی عورتوں کو ان موسموں کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔اچھے مزاج والی بوڑھی عورت اچھی رائے ظاہر کرتی ہے اور انعام پاتی ہے اور برے مزاج کی عورت بُرا ہی کہتی ہے اور بدلے میں بُرا ہی حاصل کرتی ہے۔اس کہانی میں اور بھی کردار ہیں جو آگے خلاصے میں تفصیل سے آئیں گے۔اس مضمون کو مصنف نے دہلی کی عام بول چال والی زبان میں پیش کیا ہے۔دہلی کے زبان میں استعمال ہونے والے محاوروں اور روزمرہ کا نہایت سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔اور کہانی کو آخر تک نہایت فنکارانہ انداز سے کافی دلچسپ بنایا ہے۔

مقاصد

۱۔ استاد مضمون ''ایک کہانی''، بچوں کو پڑھائے گا اور اس کی تفہیم بھی کرائے گا۔

۲۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے حالاتِ زندگی اور ادبی کارناموں سے بچوں کو واقف کرایا جائے گا۔

۳۔ مضمون ایک کہانی میں چند محاورے اور مرکبات سے بچوں کو واقف کرایا جائے گا۔

۴۔ انسان کا رویہ دوسروں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔

آموزشی ماحصل:

۱۔ بچے سبق ''ایک کہانی'' کا بنیادی مقصد سمجھ گئے ہیں۔

۲۔ بچے مرزا فرحت اللہ بیگ کے بارے میں جانکاری حاصل کر چکے ہیں۔

۳۔ دلی کی ٹکسالی زبان، روزمرے اور محاورے، ان سے طلبہ واقف ہیں اور کبھی حسب ضرورت استعمال بھی کرتے ہیں۔

۴۔ بچے نرم اور نیک رویہ رکھنے کے فوائد سمجھ گئے ہیں اور وہ ہمیشہ یہ چاہیں گے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ نرم رویئے اور خوش مزاجی سے پیش آنا چاہیے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے حالاتِ زندگی:

مرزا فرحت اللہ بیگ 1883ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ان کے والد کا نام حشمت بیگ تھا۔انہوں نے مشرقی علوم کے علاوہ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔تعلیم سے فراغت پانے کے بعد حیدرآباد چلے گئے۔یہاں مختلف عہدوں پر فائز ہوئے اور نظام کے یہاں اسسٹنٹ ہوم سیکریٹری کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ادبی صحبتوں میں رہ کر ادبی ذوق پورا کیا اور اس فن کو جلا بخشی۔وہ ایک اچھے مزاح نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان کا پہلا مضمون عصمت بیگ کے فرضی نام سے شائع ہوا۔اس کا عنوان ہم اور ہمارا امتحان تھا۔انہوں نے ہر مضمون تاریخ، تحقیق، سوانح

وغیرہ پر لکھا۔ مگر مزاحیہ رنگ غالب رہا۔ ان کے مضامین کے مجموعے ''مضامین فرحت'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ میری داستان، دہلی کا یادگار مشاعرہ، نذیر احمد کی کہانی، پھول والوں کی سیر، نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر اُردو میں یادگار ہیں۔ فرحت اللہ بیگ نے 1947ء (کہیں 1946ء) میں وفات پائی۔

ادبی کارنامے:

مرزا فرحت اللہ بیگ کے یہاں دلی کی ٹکسالی زبان ملتی ہے۔ اُنہیں زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کے انداز بیان میں دہلی کے محاوروں کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ عام طور پر مرزا فرحت اللہ بیگ کو مزاح نگار تصور کیا جاتا ہے حالانکہ اُنہوں نے انشا پردازی میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔ اُنہوں نے اپنے عہد کے دو بزرگوں کی قلمی تصویریں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کی ہیں۔ ''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' اور ''ایک وصیت کی تعمیل'' ان کے اکثر مضامین اتنے دلچسپ ہیں کہ پڑھنے والے کو آخر تک کوئی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے یہاں دہلی کی ٹکسالی زبان کی دلکشی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جزئیات نگاری اور محاورات کا برمحل اظہار ملتا ہے۔ ان کا کوئی بھی مضمون محاورہ بندی سے خالی نہیں ہے بقول عبدالماجد دریابادی ''مختصر جملے، موزوں الفاظ، خوش آہنگ لب ولہجہ، محاورات کا برمحل استعمال، نامانوس الفاظ سے گریز یہ وہ عناصر ہیں جنہوں نے فرحت کی تحریر کا تانا بانا بُنا ہے۔ اس کے علاوہ لطیف ظرافت، مقصدیت اور کہانی کا عنصر مرزا فرحت اللہ کے مضامین کا خاصا ہے۔

☆ مرزا فرحت اللہ بیگ کے قلم سے سلاست اور فصاحت کا دامن بہت کم ہی چھوٹنے پاتا ہے۔ (عبدالقادر سروری)

☆ فرحت کی زبان شگفتہ، فارسی آمیز ہے اور بعض اوقات تمسخر کچھ اس طرح ملا ہوتا ہے کہ جس میں پھول اور کانٹے نظر آئیں۔ (ڈاکٹر سید عبداللہ)

☆ خوش مذاقی کی سڑک کی داغ بیل مجھ جیسے گمنام شخص کے ہاتھوں ڈلوائی گئی۔ (مرزا فرحت اللہ بیگ)

ایک کہانی کا خلاصہ:

ایک کہانی مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاحیہ مضمون ہے۔ یہ مضمون تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مضمون کا بنیادی مقصد خوش مزاج انسان کی عزت اور بدمزاج انسانوں کی بے عزتی ہے۔ کہانی میں مختلف کردار نظر آتے ہیں۔ سعیدہ اور حمیدہ اور ان کے دو بھائی احمد اور محمود نانی سے کہانی کا تقاضا کر رہے ہیں۔ نانی کہانی شروع کرتی ہیں کہ ایک بڑھیا نے اپنے بچے کو بڑی اچھی خاصی تربیت کی۔ پال پوس کر بڑا کیا۔ اس کی شادی کی اور ایک اچھی خاصی بہو لائی۔ چند دنوں بہو گھریلو معاملات میں اچھی رہی۔ بعد میں اپنے شوہر سے مل کر ساس کی پٹائی کی۔

ساس تنگ آ کر جنگل میں ایک بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ اسی اثنا میں جاڑا، گرمی اور برسات تینوں میں جھگڑا ہوا وہ چاہتے تھے کہ ان میں کون اچھا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کیلئے وہ اسی بڑھیا کے پاس گئے۔ چونکہ بڑھیا خوش مزاج تھی اور نیک تھی اس نے سب موسموں کی تعریفیں کیں۔ کسی کا دل نہیں دُکھایا۔ سب نے خوش ہو کر بڑھیا کو ایک ایک ہزار کی اشرفیاں انعام میں دیں۔ بڑھیا خوش ہوگئی اور گھر چلی گئیں۔ روپیوں کی لالچ میں بیٹے اور بہو نے بڑھیا کی بہت عزت کی اور کچھ اشرفیاں خرچ کیں باقی بچا کے رکھیں۔

اگلے دن بہو سے رہا نہ گیا اس نے ایک ہمسائی سے کہا۔ ہمسائی نے خاوند سے کہا اور یہ تجویز پیش کی وہ بھی اپنی ماں کو اسی طرح جنگل میں چھوڑ آئے۔ وہ بڑھیا بدمزاج اور نک چڑھی تھی۔ بہو اور بیٹے نے جب اس کو جنگل میں چھوڑا تو پھر جاڑا، برسات اور گرمی اس کے پاس آئے۔ لیکن اس بڑھیا نے پہلی بڑھیا کے مقابلے میں سب کو صلواتیں سنائیں۔ سب نے اس کو مارا پیٹا یہاں تک کہ اس کو لقوہ ہوگیا اور لو بھی لگ گئی۔ زخمی حالت میں بیٹے اور بہو نے

اس کو گھر واپس لیا۔ مرہم پٹی کرنے کے بعد بڑھیا جب ٹھیک ہوئی تو سارا واقعہ گھر والوں کو سنایا۔ اُنہوں نے بھی اس کو مارا پیٹا اور گھر سے باہر نکالا۔ وہ راستے پر بھیک مانگ رہی تھی اور اس کو کوئی بھیک بھی نہیں دیتا۔ یہ اس کی بُری خصلت اور بد مزاجی کی سزا تھی۔

نصابی سوالات

سوال: پہلی بُڑھیا اور برسات کے درمیان ہوئی بات چیت کا خُلاصہ لکھئے۔

جواب: جب برسات خانم پہلی بڑھیا کے پاس چھم چھم کرتی ہوئی آتی ہے تو اُس نے برسات کو دُعائیں دیتے ہوئے اُس کی تعریف میں کہا کہ تمہاری وجہ سے ہی لوگ زندگی کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ تمہارے آنے سے باغوں کی رونق بڑھ جاتی ہے۔ گھروں میں پراٹے پکائے جاتے ہیں۔ مرد تیرا کی کا میلہ دیکھنے جاتے ہیں۔ دریاؤں میں پانی کی سطح بڑھ جاتی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ ہلکی ہلکی بارش ہوتی ہے۔ لوگ آموں کا خوب مزہ لیتے ہیں۔ برسات اپنی تعریفیں سن کے بہت خوش ہوگئی اور ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی بڑھیا کے حوالے کر کے رخصت ہوگئی۔

سوال: پہلی بُڑھیا اور جاڑے کے درمیان ہوئی بات چیت کا خُلاصہ لکھئے۔

جواب: جب جاڑا موٹا روئی کا دگلا پہنے ہوئے بڑھیا کے قریب پہنچا تو بڑھیا کو تھرتھری ہونے لگی۔ میاں جاڑے نے آنے کی وجہ بتائی تو بڑی بی نے اُس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جاڑا بہت ہی اچھا موسم ہے۔ اس موسم میں بارش ہوتی ہے۔ گھروں میں گرمی کے لئے انگیٹھیاں سلگائی جاتی ہیں۔ دالانوں پر پردے ڈالے جاتے ہیں۔ لوگ گرم گرم چائے بڑے مزے سے پیتے ہیں۔ گرم اور پھولے ہوئے چنے کھا کر لوگ اپنے خون میں اضافہ کرتے ہیں۔ لوگ کابل کے میوے خوب کھاتے ہیں۔ غرض جاڑا اپنی تعریفیں سن کر خوشی سے پھولے نہیں سمایا اور ایک ہزار اشرفیاں بڑھیا کی نذر کر کے رخصت ہو گیا۔

سوال: ''ایک کہانی'' کے درج ذیل کرداروں کا خاکہ پیش کیجئے۔

نانی، پہلی بُڑھیا، دوسری بُڑھیا، جاڑا، گرمی، برسات

جواب: مذکورہ کرداروں کے خاکے درج ذیل ہیں:

نانی کا کردار:

سبق ''ایک کہانی'' میں نانی اماں کا کردار ایک مسلم گھرانے کی عمر رسیدہ خاتون کا کردار ہے جو اپنے نواسوں اور نواسیوں کو روز کہانی سناتی ہے۔ وہ بڑی نیک، تجربہ کار، بزرگ اور صوم وصلواۃ کی پابند ہے۔ عشاء نماز کے بعد پان کھانا اُس کا روز کا معمول ہے۔ وہ بڑی بُردبار اور ذہین ہے۔ کہانی کہنے کا گُر اُس کو اچھی طرح سے آتا ہے۔ اُسکا اندازِ بیان بہت ہی دلچسپ ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اُس کا حافظہ بہت ہی قوی ہے۔ بچوں کو کہانی کے ذریعے اخلاقیات کا درس دینے میں وہ بہت ہی ماہر ہے۔ اُسے بچوں سے پیار ہے اور بچے بھی اُسے بڑی محبت کرتے ہیں۔

پہلی بڑھیا کا کردار:

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصنیف ''ایک کہانی'' میں پہلی بڈھیا ایک خوش مزاج اور نیک عورت تھی۔ یہ بڈھیا برسوں سوت کات کات کر اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی تھی۔ اپنے بیٹے کو خوب پڑھا لکھا کر اسکی شادی کر دی۔ مگر بیٹے اور بہو نے اس کی قدر نہ کی۔ پھر جنگل میں جب موسموں نے اس سے اپنے متعلق دریافت کیا تو خوش خلقی سے پیش آ کر اُس نے سب کی خوبیاں یاد کر کے ان کی تعریفیں کیں اور اس کے صلے میں انعام بھی پایا۔ انعام حاصل کر کے بھی اپنے بیٹے اور بہو کو نہیں بھلایا اور سیدھے گھر جا کر تمام اشرفیاں ان کی جھولی میں ڈال کر پھر سے ان کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی۔

دوسری بڑھیا کا کردار:

دوسری بڑھیا کا کردار ایک بدمزاج اور چڑ چڑی عورت کا کردار ہے۔ جو تینوں موسموں جاڑا، برسات اور گرمی کو خوب کوستی ہے اور اس سے قبل اپنے بسے بسائے گھر کو بھی اپنے بُرے سلوک کی وجہ سے جہنم بنا چکی تھی۔ تینوں موسموں نے اپنی برائی سن کر اس کی حالت ہی خراب کر دی اور پھر گھر والوں نے بھی جب اس کی کہانی سنی تو رہی سہی کسر پوری کر دی اور گھر سے نکال دیا۔ اب وہ سڑک پر بھیک مانگتی ہے مگر اس کی بدمزاجی کی وجہ سے کوئی اس کو بھیک بھی نہیں دیتا ہے۔

جاڑا کا کردار:

کہانی میں جاڑا کا جو کردار پیش کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاڑا ایک موسم ہونے کے باوجود انسانوں کی طرح بات کرتا ہے۔ گرم کپڑوں میں ملبوس یہ کردار جب پہلی بُڑھیا کے سامنے جاتا ہے تو وہ اُس کی خوب تعریفیں کرتی ہے جسے سن کر جاڑا بہت خوشی محسوس کرتا ہے جس کے عوض وہ بڑھیا کو ایک ہزار اشرفیاں انعام کے طور پر دیتا ہے۔ لیکن جب وہ دوسری بڑھیا سے اپنی برائی سنتا ہے تو اُسے یہ برداشت نہیں ہوتا ہے اور وہ اُسے اسکا خوب مزہ چکھاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاڑا ایسا کردار ہے جسے اپنی تعریف اچھی لگتی ہے اور اپنی برائی بالکل برداشت نہیں ہوتی ہے۔

گرمی کا کردار:

کہانی میں گرمی کا کردار نہایت ہی اہم کردار ہے۔ بڑی بی اس کی بہت تعریفیں کرتی ہے جس کے بدلے وہ اُسے اشرفیاں دیتی ہیں۔ مگر دوسری بڑھیا جب اُس کی برائی بیان کرتی تو آگ بگولہ ہو کر اُسے گرم پھونک مار کر جھلسا دیتی ہے۔ گرمی کا کردار ایک ایسا کردار ہے جس کی خواہش ہے کہ دوسرے موسموں کے مقابلے میں وہ سب سے اچھی گنی جائے۔ لوگوں کو گرمی میں جھلسانے کے باوجود بھی اس موسم کی اپنی اہمیت اور افادیت ہے۔ الغرض گرمی کا جو کردار کہانی میں پیش کیا گیا وہ نہایت ہی دلچسپ اور جاندار ہے۔

برسات کا کردار:

برسات کا کردار بہت ہی دلچسپ اور دلفریب ہے۔ بھیگے بالوں والی اور باریک کپڑے پہننے والی برسات خانم جب پہلی بڑھیا کے سامنے اپنی تعریفیں سنتی ہے تو وہ یہ سمجھتی ہے کہ باقی موسموں کے مقابلے میں وہ ہی سب سے اچھی ہے۔ اس خیال میں کھو کر وہ بڑھیا کو اشرفیاں دیتی ہے لیکن جب دوسری بڑھیا اُس کے عیب بیان کرتی ہے تو وہ غصہ میں بڑھیا کو لنگڑا کرتی ہے۔ مصنف نے بڑی فنکاری کے ساتھ پہلی بڑھیا کے ذریعے اس کے اوصاف گنوائے ہیں لیکن دوسری بڑھیا کے ذریعے اُس کے عیب بھی ظاہر کئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کردار بہت اچھا اور شاندار ہے۔

جانچ:

مندرجہ ذیل اقتباس کو غور سے پڑھ کر آخر میں دئے گئے سوالات کے جوابات لکھئے۔

گرمی کا موسم ہے چاندنی رات ہے صحن میں پلنگ بچھے ہیں۔ کھانا وانا کھا کر سب ابھی لیٹے ہیں۔ ایک پلنگ پر دو لڑکیاں سعیدہ اور حمیدہ کھسر پھسر کر رہی ہیں۔ دوسرے پلنگ پر ان کے دو چھوٹے بھائیوں احمد اور محمود میں کشتم کشتا ہو رہی ہے۔ ان کی والدہ تخت پر جانماز بچھائے عشاء کی نماز پڑھ رہی ہیں۔ ان کی نانی نے ابھی نماز سے فارغ ہو کر پاندان کھولا ہے۔ پاندان کی آواز سنتے ہی احمد اور محمود لڑائی وڑائی چھوڑ کر پلنگ سے اُٹھے اور نانی سے آ کر لپٹ گئے۔ احمد نے کہا۔ ''نانی اماں کہانی'' محمود نے کہا ''نانی اماں کہانی''

۱۔موسم کیسا ہے اور رات کس قسم کی ہے؟

۲۔دولڑکیاں پلنگ پر کیا کر رہی تھیں اوران کے نام کیا ہیں؟

۳۔بچوں کی والدہ کس وقت کی نماز ادا کر رہی ہے؟

۴۔پاندان کی آواز سن کر احمد اور محمود کس سے لپٹ گئے۔

سوال: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھو

۱۔مضمون ایک کہانی میں پہلی بڑھیا کا حال بیان کرو؟

۲۔دوسری بڑھیا کو گھر سے کیوں نکالا گیا؟

۳۔گرمی کیسی ہے پانچ جملے لکھو۔(ایک کہانی کے حوالے سے)

سوال: مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جوابات لکھو۔

۱۔مرزا فرحت اللہ بیگ کہاں پیدا ہوئے اور کب؟

۲۔ایک کہانی کس نے لکھی ہے۔ (مرزا غالب، میرامن، فرحت اللہ بیگ)

۳۔''نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' کس نے لکھا ہے؟ (میرامن/ حالی/ فرحت اللہ بیگ)

۴۔ایک کہانی کے چار کردار کون ہیں۔

۵۔مرکب کسے کہتے ہیں؟

کتابیات:

۱۔ مرزا فرحت اللہ بیگ — آزاد دائرہ معارف ویکیپڈیا

۲۔ مرزا فرحت اللہ بیگ — از عبدالقادر سروری

۳۔ وزیر آغا — اردو ادب میں طنز و مزاح

۴۔ اردو نثر کا فنی ارتقاء — فرمان فتحپوری

۵۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر سلیم اختر

آخری قدم
ڈاکٹر ذاکر حسین خان

تمہید:

مضمون ''آخری قدم'' ڈاکٹر ذاکر حسین کا لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون میں ذاکر صاحب نے فنکارانہ انداز میں ایسے ایک نیک آدمی کی مثال پیش کی ہے جو آخر تک نیک کام کرتا رہا۔ مگر دنیا کی نظروں میں وہ سب کام پوشیدہ تھے۔ کیونکہ وہ دکھاوے کے کام کرنے کے بجائے آخری دم تک سب کام خدا کے لئے اور لوگوں کی مدد کے لئے کرتا تھا۔ حالانکہ اس نے ایک ڈائری بھی رکھی تھی جس میں سب اخراجات کا حساب لکھا تھا اور اس کا نام ''حسابِ امانت'' تھا۔

لوگ اسے کنجوس مکھی چوس کہتے تھے مگر وہ سخی تھا اور کبھی چاہتا تھا کہ حسابِ امانت لوگوں کو دکھائے مگر آخری قدم پر جب اس کے مرنے کا وقت آیا اس نے وہ کتاب آگ کی نذر کی اور نیکیوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔

تعارف:

مذکورہ سبق ''آخری قدم'' پر مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بحث ہوگی۔

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین حیات، علمی، عملی وادبی کارنامے

۲۔ سبق ''آخری قدم'' کا خلاصہ

۳۔ جانچ

۴۔ کتابیات

ڈاکٹر ذاکر حسین کے حالاتِ زندگی:

ڈاکٹر ذاکر حسین کے والد فدا حسین خان تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد 1888ء میں حیدرآباد پہنچے اور وکالت شروع کی۔ ذاکر صاحب کی پیدائش 8/فروری 1897ء کو حیدر کے محلے بیگم بازار میں ہوئی۔ 39 سال کی عمر میں فدا حسین خان کا انتقال ہوا۔ ذاکر صاحب کا آبائی وطن قائم گنج تھا۔ والد کے انتقال کے وقت ذاکر صاحب کی عمر صرف 9 سال تھی۔ ان کی والدہ اپنے بچوں کو لے کر واپس قائم گنج آگئیں۔ یہاں چچا عطا حسین خان کی سرپرستی میں رہنے لگے۔ ذاکر صاحب کا داخلہ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں ہوا۔ اسکول کی تعلیم کے بعد لکھنو کے ایک اسکول میں پڑھا پھر ذاکر صاحب علی گڈھ آئے۔ یہاں ایم۔اے میں پڑھ رہے تھے کہ گاندھی جی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور دوسرے قومی رہنماؤں کی مدد سے 24/اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ کا قیام عمل آیا۔ بہت سے طالب علم اور استاد مسلم یونیورسٹی سے الگ ہوکر جامعہ میں آگئے۔ ان میں ذاکر صاحب بھی تھے۔ اس وقت ذاکر صاحب پڑھتے بھی تھے اور پڑھاتے بھی تھے۔ جامعہ میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جرمنی چلے گئے۔ جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے بعد 1926ء میں ہندوستان واپس آئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعیہ (وائس چانسلر) مقرر ہوئے۔

1948ء تک وہ جامعہ ملیہ میں کام کرتے رہے اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیم ہند) نے ذاکر صاحب کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی ذمہ داری سنبھالنے کی خواہش ظاہر کی۔ ذاکر صاحب نے یہ ذمہ داری بڑے شاندار طریقے سے نبھائی۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے 1955ء میں انہوں نے استعفیٰ دیا۔ پھر بہار کی گورنری سنبھالی۔ 1962ء میں ہندوستان کے نائب صدر اور پھر 1967ء میں صدر جمہوریہ ہند کے ممتاز ترین عہدے پر فائز ہوئے۔ 3/مئی 1969ء کو وہ انتقال کر گئے۔

”قدرت نے انہیں ایک ہمہ گیر، تہہ دار اور دل آویز شخصیت سے نوازا تھا۔ ایک مردِ مومن کی شخصیت میں جتنی ذاتی صفات کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ تمام ان میں موجود تھیں۔“

ڈاکٹر ذاکر حسین کی علمی، ادبی و عملی خدمات:

ذاکر صاحب بیک وقت بہت کچھ تھے۔ عالم، معلم، ماہرِ تعلیم، مصنف، مترجم، مقرر، مفکر، اعلیٰ منتظم، محبِ وطن، مجاہدِ آزادی، خاموش قائد، ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار، متحدہ قومیت کے طرفدار، دانشور، سیاست دان، سچے مسلمان اور فخر و نازشِ ہندوستان۔ ماہر معاشیات کے علاوہ کامیاب انشا پرداز تھے۔ ذاکر صاحب نے بچوں کے ادب سے غیر معمولی دلچسپی لی اور ان کی بدولت اُردو میں بچوں کے ادب کی اہمیت بڑھی۔ انہوں نے بچوں کے لئے خود لکھ کر پاس پتھر کا کام کیا۔ ذاکر صاحب نے بچوں کے لئے کئی کتابیں لکھیں۔

ذاکر صاحب اعلیٰ اقدار کے پاسبان، ملک و ملت کی تعمیر، ترقی اور مفاد کے نگہبان، مثالی اور عملی انسان تھے۔ ان کی حیات اور ان کی خدمات کے کئی آہنگ ہیں جن لوگوں نے اُنہیں دور سے دیکھا وہ کم اور جن لوگوں نے قریب سے دیکھا، جانا، پہچانا، سمجھا، پرکھا اور برتا وہ زیادہ اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ ذاکر صاحب حسنِ صورت میں بے مثال اور حُسنِ سیرت میں باکمال تھے۔ مزاج و منہاج میں منفرد، فکر و عمل میں ہمیشہ مستعد، تعلیم و تعلم ان کا پسندیدہ پیشہ اور تقریر و تحریر ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی شخصیت میں جلال بھی تھا اور جمال بھی۔

ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں۔ ان میں بڑوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ درس ہوتا تھا۔ پہلے فرضی نام سے لکھتے تھے بعد میں اپنے نام سے بچوں کے لئے رسالہ ”پیام تعلیم“ جاری کیا۔ اس میں خود لکھا اور دوسروں کے مضامین چھپوائے۔ ذاکر صاحب کی کہانیوں کا مجموعہ ”ابوخان کی بکری“ کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ ذاکر صاحب کو بچوں کے ادب سے لگاؤ تھا۔ وہ بچوں سے ہمدردی بھی کرتے تھے اور ان کی تربیت کے لئے کوشاں بھی تھے۔ اسی سلسلے میں وہ آخر تک ان کے لئے کام کرتے رہے۔

سبق ”آخری قدم“ کا خلاصہ:

ڈاکٹر ذاکر حسین کا مضمون ”آخری قدم“ ایک نیک اور سخی آدمی کی کہانی ہے۔ جو دکھاوے اور نمائش سے دور رہتا ہے مگر غریبوں، ناداروں، محتاجوں، یتیموں کی مدد کرتا ہے۔ لوگ اس کو مکھی چوس کہتے ہیں مگر اس کے پیسے سے نہ جانے کتنے یتیم خانے چلتے ہیں۔ کتنے سماجی، تعلیمی ادارے مدد پاتے ہیں، کتنی بیوہ عورتیں مدد حاصل کرتی ہیں مگر یہ سب کام وہ چھپ کر کرتا ہے کسی کو پتہ بھی نہیں لگتا۔ وہ عیش و مستی کی زندگی سے دور سادہ زندگی بسر کرتا ہے اس کے دوست اور احباب اس آدمی کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کنجوس کہتے ہیں۔ اس نے ایک حساب کی کتاب بھی رکھی جس میں وہ سارے خرچہ کا حساب لکھتا ہے اس کے جلد پر سنہری حروف میں لکھا ہے ”حسابِ امانت“

اس کتاب میں خرچہ و حساب کے علاوہ کچھ دلچسپ اندراجات بھی تھے۔ کسی یتیم کی مدد کی اور وہ ڈاکٹر بن گیا۔ ایک تعلیمی ادارے کی مدد کی اب اس کی کئی شاخیں ہیں۔ تب بھی لوگ اس کو کنجوس کہتے ہیں۔ اس کا دل دُکھی ہوجاتا ہے اور وہ حسابِ امانت کھول کر دل کو تسلی دیتا ہے۔ کبھی یہ کتاب لوگوں کو دکھانے کی سوچتا تھا تاکہ اس کی اصلیت ان پر ظاہر ہو جو اس کو کنجوس کہتے ہیں اور وہ لوگ شرمندہ ہوجائیں گے۔

آخر کار ایک دن سخت بیمار ہوا۔ نمونیہ کا اثر ہوا۔ بے ہوش ہوا اور سوچا کہ اب جانے کا وقت ہے۔ حسابِ امانت کو کھولا۔ آنکھوں سے آنسو نکلے۔ حساب امانت کو انگھیٹی میں پھینک دیا۔ کتاب جلنے لگی۔ موذن نے اذان دی اور نیک آدمی نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کیں اور اس کے آخری قدم کبھی نہ ڈگمگائے اور یہ نیک آدمی اپنے ساتھ اپنی تمام نیکیوں کو لے گیا۔

سوال: لوگ اُس نیک آدمی کو ''کنجوس مکھی چوس'' کیوں کہتے تھے؟

جواب: وہ نیک آدمی ایک بڑا دولت مند شخص تھا۔مگر وہ اپنی دولت کو خدا کی دی ہوئی امانت سمجھتا تھا اور اس کا استعمال بندگانِ خدا کی مدد کرنے میں ہی کیا کرتا تھا۔اس کے دوست اور احباب اس کو بہلا پھسلا کر طرح طرح کے کھیل تماشوں میں دھکیل کر عیش کرنا چاہتے تھے مگر وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیا کرتے تھے۔ یہ نیک شخص بڑی سیدھی سادی زندگی گزارا کرتا تھا۔معمولی سے کپڑے پہنتا اور روکھی سوکھی روٹی کھا کر بسر کرتا تھا۔سب لوگ اس وجہ سے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور اس کو ''کنجوس مکھی چوس'' کہا کرتے تھے۔

جانچ:

درج ذیل غیر نصابی اقتباس کو غور سے پڑھو اور آخر پر دئے گئے سوالات کے جوابات لکھو۔

خودی جو انسان کو برباد کرنے والی چیز ہے جب چپ چاپ سوئی ہوئی ہوتی ہے تو خوشامد اس کو جگاتی اور ابھارتی ہے اور جس کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں چھچھورے پن کی کافی لیاقت پیدا کر دیتی مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح خوشامد ایک بدتر چیز ہے۔اسی طرح مناسب اور سچی تعریف کرنا نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز ہے۔

۱۔ خوشامد انسان کے اندر کس چیز کو جگاتی ہے؟

۲۔ جس شخص کی خوشامد کی جاتی ہے اس میں کس قسم کی لیاقت پیدا ہوتی ہے؟

۳۔ نہایت عمدہ اور بہت ہی خوب چیز کیا ہے؟

سوال: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات لکھو۔

۱۔ سبق ''آخری قدم'' کا خلاصہ لکھو۔

۲۔ ذاکر حسین کے حالاتِ زندگی یا ادبی خدمات پر نوٹ لکھو۔

۳۔ ذاکر صاحب نے ''آخری قدم'' میں نیک آدمی کے بارے میں کیا لکھا ہے۔

۴۔ ''آخری قدم'' کا مقصد کیا ہے؟

سوال: مختصر جوابات لکھو۔

۱۔ ''حسابِ امانت'' کس چیز کا نام ہے۔

۲۔ دنیا کا کتا ''کنجوس مکھی چوس'' کس کو کہتے تھے؟

۳۔ ذاکر حسین کے والد کا نام تھا۔ (طالب حسین/ محمد حسین/ عطا حسین/ فدا حسین)

۴۔ ذاکر حسین کہاں پیدا ہوئے؟ (دہلی/ اتر پردیش/ حیدر آباد)

۵۔ ذاکر صاحب کب صدر جمہوریہ ہند بنے (1969ء/ 1966ء/ 1964ء)

۶۔ ''ابو خان کی بکری'' کس نے لکھی ہے؟ (مولانا حالی/ شبلی/ فدا حسین/ ذاکر حسین)

کتابیات:

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین حیات فکر اور عمل — مرتب عبدالغفار شکیل

۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین حیات اور کارنامے — ڈاکٹر خلیل انجم

ایک یادگار وصیت
پنڈت جواہر لال نہرو

تعارف:

آداب۔ پیارے بچو۔کیا آپ اپنے علاقہ اور ملک کا نام بتائیں گے؟۔جی ہاں اس ملک کا نام ہندستان ہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک مشہور نام پنڈت جواہرلعل نہرو تھا جو آزادی کے بعد ہندستان کے پہلے وزیراعظم بن گئے۔ان کو چاچا نہرو کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اگلے صفحات میں طلبا و طالبات پنڈت جواہرلعل نہرو کے بارے میں تفصیل سے جان لیں گے۔

مقاصد:

ان صفحات کے مطالعہ کے بعد درج ذیل مقاصد پورے ہونگے:

ا۔ پنڈت جواہرلعل نہرو کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے طلبا و طالبات واقف ہوجائیں گے۔

۲۔ پنڈت جواہرلعل نہرو کی تحریر جو''ایک یادگار وصیت'' کے عنوان سے شایع ہوئی ہے سے طلبا و طالبات واقف ہونگے

۳۔اس باب میں استعمال کئے گئے الفاظ،محاورات اور دیگر قواعد اردو سے بھی طلبا و طالبات روشناس ہونگے۔

آموزشی محاصل :

اس مضمون کے مطالعہ کے بعد طلبا و طالبات درج ذیل محاصل کے اہل ہیں:

ا۔ پنڈت جواہرلعل نہرو کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر خود روشنی ڈالتے ہیں۔نیز وطن پرستی کا جذبہ بھی سمجھتے ہیں۔

۲۔ پنڈت جواہرلعل نہرو کی تحریر ''ایک یادگار وصیت'' کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

۳۔اس باب میں استعمال کئے گئے الفاظ،محاورات اور دیگر قواعد اردو کو کہیں بھی استعمال کرتے ہیں۔

موضوع کی تفصیل:

حیات: پنڈت جواہرلعل نہرو 14 نومبر 1889ء میں الہٰ آباد میں پیدا ہوئے۔انہوں نے ابتدائی تعلیم ہندوستان میں ہی حاصل کی اوراعلیٰ تعلیم کیلئے انگلستان بھیجے گئے۔ جہاں سے وکالت کا امتحان پاس کر کے لوٹے لیکن ہندوستان آکر وکالت کے بجائے گاندھی جی کی قیادت میں سیاست کے میدان میں کود پڑے۔جلد ہی اپنی قائدانہ صلاحیت کی وجہ سے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر چنے گئے۔جب ہندوستان آزاد ہوا تو پنڈت نہرو اس کے پہلے وزیرِاعظم بنے اور اپنی زندگی کے آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ان کے دورِ حکومت میں ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوا اور ہر طرف امن وامان اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا۔ان کا انتقال 27 مئی 1964ء کو ہوا۔

طرزِ تحریر: پنڈت نہرو بنیادی طور پر انگریزی زبان کے ایک ادیب تھے مگر اپنی تقریر کے لئے وہ خالص ہندوستانی زبانوں یعنی اُردو اور ہندی کا استعمال کرتے تھے۔ان کی تحریر ہو یا تقریر دونوں میں امن اور سکون کا پیام اور آپسی بھائی چارے کا درس ملتا ہے۔قدرت نے ان کے دل ونظر میں کشادگی عطا کی تھی اسلئے وہ مذہبی تعصب سے بہت نفرت کرتے تھے اور ہندوستان میں تمام فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کے حامی تھے۔''تلاش ہند'' اُن کی مشہور تصنیف ہے۔

سبق کا خلاصہ:

سبق ''ایک یادگار وصیت'' پنڈت جواہر لعل نہرو کی تقاریر سے لیا گیا ایک اقتباس ہے۔اس میں پنڈت نہرو ہندوستانی عوام کی محبت اور احترام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ اس کا بدلہ چکانا میرے لیے ناممکن ہے کیوں کہ محبت ایک انمول شئے ہوتی ہے۔خود کو حقیقی معنوں میں اس کے لایق بنانے کے حوالے سے نہرو کہتے ہیں کہ میں اپنی باقی ماندہ زندگی اپنے ہم وطنوں کی خدمت میں گزارنا چاہتا ہوں۔ساتھ ہی جدوجہدِ آزادی اور بعد کے مراحل میں اپنے ہم سفر ساتھیوں کی احسان مندی ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لوگ کامیابی اور ناکامی کے ہر مرحلے میں ساتھ نبھاتے آئے ہیں۔

چونکہ یہ ایک وصیت ہے اسلئے پنڈت نہرو اپنی وفات کے بعد کے رسوم کے تعلق سے اپنی ناراضگی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کھوکھلی رسم پرستی سراسر دھوکہ دہی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ان کی مٹھی بھر راکھ گنگا میں بہادی جائے مگر کسی مذہبی خیال سے نہیں بلکہ اسلئے کہ گنگا اپنے اندر ہندوستانی تہذیب کو سمیٹے ہوئی ہے۔اپنی باقی ماندہ راکھ کے متعلق کہتے ہیں کہ اسے ہندوستان کے کھیتوں میں بکھیر دیا جائے تاکہ وہ اس خاک کا ابدی حصہ بن جائے۔

پنڈت نہرو ہندوستانی عوام کو روایات اور رسموں کی زنجیر سے خود کو آزاد کرنے کیلئے جدوجہد پر آمادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان رسموں اور روایات کو ایک بوجھ کی طرح اپنے ساتھ لیے پھرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے جو ہمیں آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ساتھ ہی کچھ اچھی چیزوں پر فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں کیونکہ یہ اچھی چیزیں ہندوستان کا تہذیبی ورثہ ہیں۔پنڈت جواہر لعل نہرو نے ''ایک یادگار وصیت'' میں ہندوستان کی قدیم تہذیب کو گنگا ندی کے ساتھ وابستہ کر کے کہا ہے کہ گنگا اس تہذیب کی ایک نشانی ہے۔اس ندی نے ہندوستان میں مختلف نسلوں کا آباد ہونا اور ان کا یہاں صدیوں سے زندگی گزارنا قریب سے دیکھا ہے۔یہی ندی اُن کے سکھ دکھ کی گواہ ہے۔صدیوں سے ہندوستانی تاریخ، قصے، کہانیوں، گیت اور سنگیت اس کے ساتھ جڑ گئے ہیں اور اس کے پانی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔یہی گنگا ایک تہذیبی زنجیر بناتی ہے جس میں ہر ہندوستانی بندھا ہوا ہے اور جو کبھی اور کہیں نہیں ٹوٹتی ہے۔یہی ندی ہندوستان کو اس کے ماضی کے ساتھ جوڑتی ہے۔اسلیے پنڈت نہرو وصیت کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد اُن کی مٹھی بھر راکھ احترام کے طور پر گنگا میں بہادی جائے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو ہندوستانی عوام کو ''ایک یادگار وصیت'' میں یہ پیغام دیتے ہیں کہ انہیں خود کو روایات اور رسموں کا قیدی نہیں بنانا چاہیے کیونکہ یہ زنجیریں انہیں ترقی کی راہوں میں آگے نہیں بڑھنے دیتی ہیں اور سماج کے مختلف طبقوں اور مذہبوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں کے درمیان نا اتفاقی اور نابرابری کو بڑھاوا دیتی ہے۔اسلئے آج کے حالات کا یہی تقاضہ ہے کہ ان بندھنوں سے خود کو بالکل آزاد کیا جائے۔لیکن پنڈت نہرو ماضی کی ہر ایک چیز کو بالکل بے فائدہ اور قابلِ ترک بھی قرار نہیں دیتے ہیں۔وہ ماضی کے تہذیبی ورثے کی اہم باتوں کو لائقِ تحسین اور قابلِ فخر قرار دیتے ہیں اور اس بات کا کھلا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ہر ہندوستانی کی طرح وہ بھی اس تہذیبی زنجیر کا حصہ ہیں جو کبھی اور کہیں نہیں ٹوٹتی ہیں۔

پنڈت نہرو ''ایک یادگار وصیت'' میں اپنی موت کے بعد اپنی راکھ کے بیشتر حصے کو ہوائی جہاز میں لے جا کر ہندوستان کے کھیتوں میں بکھیرنے پر زور دیتے ہیں تاکہ ان کی راکھ ہندوستان کی مٹی میں مل کر اس ملک کا ابدی حصہ بن جائے۔یہ دراصل پنڈت نہرو کے وطن کے ساتھ وابستہ جذبات کا اظہار ہے کہ وہ وطن سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ مر کر بھی اس سے الگ ہونا نہیں چاہتے ہیں۔

مشقی سوالات

سوال : پنڈت جواہر لعل نہرو نے ''ایک یادگار وصیت'' میں گنگا ندی کو ہندوستانی تہذیب کی نشانی قرار دیا ہے وضاحت کیجئے۔

جواب: پنڈت جواہر لعل نہرو نے ''ایک یادگار وصیت'' میں ہندوستان کی قدیم تہذیب کو گنگا ندی کے ساتھ وابستہ کر کے کہا ہے کہ گنگا اس تہذیب کی ایک نشانی ہے۔اس ندی نے ہندوستان میں مختلف نسلوں کا آباد ہونا اوران کا یہاں صدیوں سے زندگی گزارنا قریب سے دیکھا ہے۔یہی ندی اُن کے سکھ دکھ کی گواہ ہے۔صدیوں سے ہندوستانی تاریخ، قصے، کہانیوں، گیت اور سنگیت اس کے ساتھ جُڑ گئے ہیں اوراس کے پانی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔یہی گنگا ایک تہذیبی زنجیر بناتی ہے جس میں ہر ہندوستانی بندھا ہوا ہے اور جو کبھی اور کہیں نہیں ٹوٹتی ہے۔یہی ندی ہندوستان کواس کے ماضی کے ساتھ جوڑتی ہے۔اسلیے پنڈت نہرو وصیت کرتے ہیں کہ مرنے کے بعداُن کی مٹھی بھر راکھ احترام کے طور پر گنگا میں بہادی جائے۔

سوال : پنڈت جواہر لعل نہرو ہندوستانی عوام کو کیا پیغام دیتے ہیں؟

جواب: پنڈت جواہر لعل نہرو ہندوستانی عوام کو''ایک یادگار وصیت'' میں یہ پیغام دیتے ہیں کہ انہیں خود کو روایات اور رسموں کا قیدی نہیں بنانا چاہیے کیونکہ یہ زنجیریں انہیں ترقی کی راہوں میں آگے نہیں بڑھنے دیتی ہیں اور سماج کے مختلف طبقوں اور مذہبوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگوں کے درمیان نا اتفاقی اور نابرابری کو بڑھاوا دیتی ہے۔اسلئے آج کے حالات کا یہی تقاضہ ہے کہ ان بندھنوں سے خود کو بالکل آزاد کیا جائے۔لیکن پنڈت نہرو ماضی کی ہر ایک چیز کو بالکل بے فائدہ اور قابل ترک بھی قرار نہیں دیتے ہیں۔وہ ماضی کے تہذیبی ورثے کی اہم باتوں کو لائقِ تحسین اور قابلِ فخر قرار دیتے ہیں اوراس بات کا کھلا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ہر ہندوستانی کی طرح وہ بھی اس تہذیبی زنجیر کا حصہ ہیں جو کبھی اور کہیں نہیں ٹوٹتی ہیں۔

سوال : پنڈت نہرو ہندوستان کا ابدی حصہ کیونکر بننا چاہتے ہیں؟

جواب: پنڈت نہرو''ایک یادگار وصیت'' میں اپنی موت کے بعد اپنی راکھ کے بیشتر حصے کو ہوائی جہاز میں لے جا کر ہندوستان کے کھیتوں میں بکھیرنے پر زور دیتے ہیں تا کہ ان کی راکھ ہندوستان کی مٹی میں مل کراس ملک کا ابدی حصہ بن جائے۔یہ دراصل پنڈت نہرو کے وطن کے ساتھ وابستہ جذبات کا اظہار ہے کہ وہ وطن سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ مر کر بھی اس سے الگ ہونا نہیں چاہتے ہیں۔

حبِ وطن کے عنوان پر مضمون:

اپنے ملک اور وطن سے محبت کا نام حب وطن ہے۔یہ ایک نہایت پاک جذبہ ہے۔جو انسانوں میں ہی نہیں بلکہ پرند و چرند اور دیگر جانوروں میں بھی موجود ہوتا ہے۔انسان پرائے دیس میں کتنا ہی خوش کیوں نہ ہو اسے اپنے وطن کی یاد ہمیشہ ستاتی ہے۔خواہ اسکے ملک میں جھونپڑیوں اور تنگ و تاریک گلیوں کے سوا کچھ نہ ہو۔چنانچہ وطن کا کانٹا پردیس کے پھول سے خوشنما ہوتا ہے۔وطن سے دوری کا غم بہت گہرا ہوتا ہے۔

دشمن کو بھی اللہ نہ چھڑائے وطن سے — جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے — (انیسؔ)

حب الوطن کا جذبہ ہی قوموں کی حقیقی میراث اور قومی یکجہتی کا راز ہے۔سچے محبّ الوطن اپنے ملک کی خاطر قید و بند، مشکلات، جسمانی اذیتیں اور ضرورت پڑنے پر جان کا نزرانہ بھی پیش کرتے ہیں۔امام خمینی، نیلسن منڈیلا، قائد اعظم، گاندھی، علی محمد جوہر، نہرو جیسے لوگوں نے نے وطن کی خاطر لطائف

زندگی کو خیر آباد کہا۔ ٹیپو سلطان، اشفاق اللہ، بھگت سنگھ، گرو دت، اور عمر مختار جیسے لوگوں نے تو وطن کی ناموس کی خاطر موت کو گلے لگایا۔ سچا محبّ الوطن ہمیشہ اپنے ملک کے امن، سلامتی اور خوش حالی کا دعا گو رہتا ہے۔ سچا محبّ الوطن کی جان توڑ کوششوں سے اپنے وطن کی تجارت، تعلیم، تہذیب وتمدن اور صنعت وحرفت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ چنانچہ کروڑوں ہندوستانیوں کی حب الوطن کا ہی نتیجہ ہے کہ ہندوستان ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہوا۔ سچے محبّ الوطن کی قسم کا رنگی، نسلی اور مذہبی تعصب نہیں رکھتے۔ وہ ہر ہم وطن کو بھائی سمجھتے ہیں۔ وہ ہر سطح پر قومی یکجہتی کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ وہ انفرادی فائدے پر ہمیشہ قومی مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ قوم کی سربلندی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہر ایسا کام کرتے ہے جس سے ملک وقوم کو فائدہ پہنچتا ہو۔

وطن کی محبت حقیقت پسندانہ بھی ہونی چاہیے۔ یہ کسی بھی قسم کی جاہلانہ عصبیت پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ اسلئے ضروری ہے کہ حب الوطنی کو بنیادی انسانی قدروں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ ہمیں زبان ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اپنے وطن کی خاطر کچھ کر دکھانا چاہیے۔ اور اپنے ملک کو امن وسلامتی کا گہوارہ بنانے چاہیے تاکہ ہماری آئندہ نسلیں کہیں۔

کیا شکر ہو الٰہی سب کچھ عطا کیا ہے   مرے وطن کو تو نے جنت بنا دیا ہے

محاکمہ

ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک مشہور نام پنڈت جواہر لعل نہرو تھا جو آزادی کے بعد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم بن گئے۔ ان کو چاچا نہرو کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ان کی ایک تقریر سے لئے گئے اقتباس کو ''ایک یادگار وصیت'' کے عنوان سے گیارہویں جماعت کی درسی کتاب بہارستان اردو میں شامل کیا گیا ہے جس میں پنڈت نہرو نے ہندستان میں پائے جانے والے کئی مقامات خاص کر دریاؤں کا ذکر کیا ہے جس میں دریائے گنگا کا خاص طور سے ذکر ہے۔ اس میں حب الوطنی کے پہلو پر پنڈت نہرو نے خصوصی زور دیا ہے۔

جانچ:

۱۔ سبق ''ایک یادگار وصیت'' کا خلاصہ بیان کیجئے۔

۲۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے ''ایک یادگار وصیت'' میں گنگا ندی کو ہندوستانی تہذیب کی نشانی قرار دیا ہے وضاحت کیجئے۔

۳۔ پنڈت جواہر لعل نہرو ہندوستانی عوام کو کیا پیغام دیتے ہیں؟

۴۔ پنڈت نہرو ہندوستان کا ابدی حصہ کیونکر بنا چاہتے ہیں؟

کتابیات:

۱۔ پنڈت جواہر لال نہرو   وکی پیڈیا (انٹرنیٹ)

۲۔ The Discovery Of India   پنڈت جواہر لال نہرو

سِلک روٹ
عبدالغنی شیخ لداخی

تعارف:

سلک روٹ جوشاہراہِ ابریشم کے نام سے بھی مشہور ہے قدیم دنیا کی سب سے مشہور لمبی شاہراہ ہے جو سرینگر اور لداخ سے ہوتے ہوئے روئے زمین پر انتہائی دشوار گذار خطّوں سے گزرتی تھی۔ یہ چین سے ہوتی ہوئی یورپ میں قدیم سلطنت روما تک جاتی تھی۔ چین کے شہر گوانگ زہو سے بحرِ روم کی بندرگاہ تک اِس کی لمبائی تقریباً پندرہ ہزار کلومیٹر تھی۔اس پر تفصیلی گفتگو لداخ کے ایک ادیب جناب عبدالغنی شیخ صاحب نے کی ہے جو گیارہویں کی درسی کتاب ''بہارستان اردو'' میں درج کی گئی ہے اور آج آپ کے زیرِ مطالعہ ہے

مقاصد:

اس درسی مواد کے مطالعہ کے بعد درج ذیل مقاصد پورے ہونگے:

ا۔عبدالغنی شیخ کے حالات زندگی اور ادبی خدمات سے طلبا وطالبات واقف ہو جائیں گے۔

۲۔ عبدالغنی شیخ کی تحریر کردہ کتاب جو''لداخ تہذیب وثقافت'' اور ان کی دیگر ادبی خدمات سے طلبا وطالبات واقف ہونگے

۳۔اس باب میں استعمال کئے گئے الفاظ، محاورات اور دیگر قواعد اردو سے بھی طلبا وطالبات روشناس ہونگے۔

آموزشی محاصل :

اس مضمون کے مطالعہ کے بعد طلبا وطالبات درج ذیل محاصل کے اہل ہیں:

ا۔ عبدالغنی شیخ کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر خود روشنی ڈال دیتے ہیں۔

۲۔ عبدالغنی شیخ کی تحریر ''سلک روٹ'' کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

۳۔اس باب میں استعمال کئے گئے الفاظ، محاورات اور دیگر قواعد اردو کو کہیں بھی استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ طلاب کسی بھی سیاحتی مقام یا ابریشم صنعت پر مضمون لکھنے کے اہل ہیں۔

موضوع کی تفصیل:

مصنف کے حالاتِ زندگی: عبدالغنی شیخ کے اجداد کسی زمانے میں وادیٔ کشمیر سے تجارت کے سلسلے میں لداخ آ گئے تھے اور یہاں ہی مکمل طور سے بودوباش اختیار کی۔عبدالغنی شیخ کا جنم 1936ء کو لیہہ میں ہوا۔ابتدائی تعلیم کے لئے گورنمنٹ مڈل اسکول لیہہ میں داخلہ لیا۔عبدالغنی شیخ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے سرینگر نہ جا سکے مگر انہوں نے پرائیوٹ طور سے ہی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور پہلے ادیبِ فاضل، اس کے بعد بی،اے انگریزی آنرز کے امتحانات پاس کیے۔اس کے بعد ہسٹری میں ایم،اے کی ڈگری حاصل کی۔ طالبِ علمی کے زمانے سے ہی ان کو تاریخ سے دلچسپی ہوئی اور اسی دوران انہوں نے تاریخ لداخ پر کئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے محکمہ افزائش حیوانات میں اسٹاک اسسٹنٹ اور پھر محکمۂ تعلیم میں بطورِ مدرس بھی کچھ دیر کام کیا۔اس کے بعد انہوں نے یونین پبلک سروس کمیشن کے انڈین انفارمیشن سروس کا امتحان پاس کیا اور پریس انفارمیشن بیورو اور آل انڈیا ریڈیو میں اپنی خدمات انجام دیں۔اس دوران انہوں نے میڈیا سے وابستہ کئی ورکشاپ اور سمیناروں میں حصہ لیا۔وہ آج بھی تصنیف وتالیف میں مصروف ہیں۔

ادبی خدمات: افسانہ اور ناول کے علاوہ عبدالغنی شیخ تاریخ، فلسفہ اور مذاہب پر بھی خوب لکھتے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد ۱۷ ہے جن میں چھ فکشن، پانچ تاریخ اور دو بچوں کے لئے ہیں۔ ''دل ہی تو ہے'' (ناول)، ''وہ زمانہ'' (ناول)، ''زوجیلا کے آر پار'' (افسانوی مجموعہ)، ''دوراہا'' (افسانوی مجموعہ)، ''سونم نربو'' (سوانح عمری)، ''قلم، قلمکار اور کتاب'' (ادبی نوشتہ) اور ''لداخ تہذیب وثقافت'' (تاریخ) وغیرہ اُن کی کتابوں میں شامل ہیں۔ ان کے ناول ''دل ہی تو ہے'' کو ریاستی کلچرل اکیڈمی کی طرف سے بہترین کتاب کا انعام بھی ملا ہے۔

ہماری نصابی کتاب ''بہارستانِ اُردو'' میں درج سبق ''سلک روٹ'' عبدالغنی شیخ کا لکھا ہوا ایک تاریخی مضمون ہے۔ یہ مضمون اُن کی تحریر کردہ تاریخی کتاب ''لداخ تہذیب وثقافت'' سے ماخوذ ہے۔ اس مضمون میں دنیا کی سب سے مشہور لمبی پُر اسرار شاہراہ سِلک روٹ کی تاریخی اہمیت اور افادیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں سلک روٹ کی اقتصادی، سماجی اور تہذیبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

سلک روٹ جو شاہراہِ ابریشم کے نام سے بھی مشہور ہے قدیم دنیا کی سب سے مشہور لمبی شاہراہ ہے جو روئے زمین پر انتہائی دشوار گذار خطّوں سے گزرتی تھی۔ یہ چین سے ہوتی ہوئی یورپ میں قدیم سلطنت روما تک جاتی تھی۔ چین کے شہر گوانگ زہو سے بحرِ روم کی بندرگاہ تک اِس کی لمبائی تقریباً پندرہ ہزار کلومیٹر تھی۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک مال واسباب کی نقل وحمل میں ایک سال کا عرصہ لگتا تھا۔ شاہراہ پر بہت سارے شہر، قصبے اور بستیاں آباد تھیں۔ مسافروں اور تاجروں کی رہائش کے لیے جابجا سرائیں بنی تھیں اور مال کی نمائش اور خرید وفروخت کے لیے ایمپوریم بنے تھے۔ اس شاہراہ سے صدیوں تک تاجر، مبلغ، یاتری، فوجی اور مسافر ہو گزرے ہیں۔ جہاں جہاں سے لوگ گزرتے تھے وہاں اپنی تہذیب کی چھاپ اور نشان چھوڑتے تھے۔ جرمنی کے ایک محقق اور جغرافیہ دان بارون رچھتافین نے ریشم کی مناسبت سے اِس شاہراہ کا نام سلک روٹ رکھا۔ سلک روٹ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے کم از کم دوسو سال پرانی ہے۔ تجارت اور برآمدات کے علاوہ شاہراہِ ابریشم کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی اہمیت رہی ہے۔ مختلف مذاہب کی تشہیر اور تبلیغ کے حوالے سے بھی اس عظیم شاہراہ کی اہمیت اور افادیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

شاہراہ ابریشم کی بڑی تجارتی اہمیت رہی ہے۔ اس راستے سے مختلف ممالک کے مابین بے شمار اشیاء کی برآمد اور درآمد کا سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا۔ اس راستے پر چین سے ریشم، کاغذ، چھپائی کا سامان، بلوریں برتن اور بارود برآمد ہوتے تھے۔ وسط ایشیا سے گھوڑے، عطریات، نیل کے بنے رنگ، ناشپاتی اور اخروٹ وغیرہ برآمد کیے جاتے تھے۔ ہندوستان کی برآمدات میں کپاس، کالی مرچ اور صندل کی معطر لکڑی شامل تھی۔ مغرب سے شیشے اور شیشے کے آرائشی سامان مشرقی ممالک میں برآمد کیے جاتے تھے۔ مغرب سے انگور کی بیلیں بھی آئیں اور مشرق نے شراب کشید کرنا سیکھا۔ تجارت کے فروغ کے ساتھ اِن خطوں کی مصنوعات کی درآمدات اور برآمدات میں اضافہ ہوتا گیا۔

تجارت اور برآمدات کے علاوہ شاہراہِ ابریشم کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی اہمیت رہی ہے۔ سلک روٹ اور اس کی شاخوں کے راستوں سے دنیا کے بڑے مذاہب اس خطے میں پہنچے، سلک روٹ نے ایک دوسرے کو اپنی تہذیب، کلچر، علم وعرفان اور فنونِ لطیفہ سے روشناس کیا جن کی وجہ سے مشرق اور مغرب پر بڑے گہرے اور قوی اثرات پڑے۔ یہی خصوصیات سلک روٹ کی تاریخی اہمیت کو بڑھاتی ہیں اور عالموں، دانشوروں اور محققوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

مارکو پولو ایک عظیم مغربی سیاح تھا۔ اُنہوں نے اپنی ساری زندگی دشوار گذار سفر طے کیے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے مشہور سفر نامے میں شاہراہِ ابریشم کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ سلک روٹ کے ریگستانی حصے پر مجھے مختلف مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ سفر کے تیس دن مشکل ترین تھے، اِس دوران ایک دن اور ایک رات سفر کرنے کے بعد پانی ملتا تھا۔

نصابی سوالات

سوال نمبر ۱ : قدیم دنیا کی سب سے لمبی اور پراسرار شاہراہ کا نام بتایئے؟

جواب: قدیم دنیا کی سب سے لمبی اور پُر اسرار شاہراہ کا نام سلک روٹ ہے جو شاہراہ ابریشم کے نام سے بھی مشہور ہے۔

سوال نمبر ۲: شاہراہ ابریشم کی لمبائی کتنی تھی؟

جواب: شاہراہ ابریشم چین کے شہر گوانگ زہو سے بحرِ روم کی بندرگاہ تک اس کی لمبائی تقریباً پندرہ ہزار کلومیٹر تھی۔

سوال نمبر۳: شاہراہِ ابریشم سے کون کون لوگ گذرتے تھے؟ چند ایک کے نام بھی لکھئے۔

جواب: شاہراہِ ابریشم سے صدیوں تک تاجر، مبلغ، یاتری، فوجی اور مسافر گذرتے تھے۔ جہاں جہاں سے لوگ گزرتے تھے وہاں اپنی تہذیب کی چھاپ اور نشان چھوڑتے تھے۔ جرمنی کے ایک محقق اور جغرافیہ دان بارون رچھتافین ان میں ایک ہیں۔

سوال نمبر٤: شاہراہِ ابریشم پر موجودہ مختلف بستیوں کے نام لکھیے۔

جواب: چین، روم، برصغیر ہندوستان، سنٹرل ایشیا، ایران، پامیر، گلگت بلتستان، لداخ، مغربی تبت، ترکستان، کاشغر، یارقند، ہُنزہ وغیرہ وہ خطے ہیں جو شاہراہِ ابریشم پر موجود ہیں۔

سوال نمبر۵: وادی کشمیر کے کسی صحت افزا مقام کی سیر پر ایک مضمون لکھئے

سیاحتی مقام کا سفر

وادئ کشمیر اپنی صحت افزا مقامات کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے اور وہ ایسی دلکش اور دلفریب ہیں کہ ایک بار دیکھنے والا بار بار دیکھنے کی چاہت کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرون ملک سے ہر سال سیاح یہاں آ کر صحت افزا مقامات کی سیر کا موج اڑاتے ہیں ویسے یہاں کے صحت افزا مقامات جیسے نشاط باغ، شالیمار باغ، گلمرگ، یوس مرگ، ویری ناگ، اچھابل وغیرہ وغیرہ اپنی خوبصورتی میں بے مثال ہیں مگر پہلگام سب سے زیادہ خوبصورت صحت افزا مقام ہے میں نے اکثر صحت افزا مقامات کی سیر کی تھی لیکن پہلگام دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔ جب کوئی میرے سامنے پہلگام کی نزاکت اور خوبصورتی کا تذکرہ کرتا تھا تو میرا دل سخت مچل اٹھتا اور دیکھنے کیلئے دل تڑپتا تھا۔

خدا کا کرنا تھا کہ گرمی کے موسم میں ہمارے اسکول کے طلباء نے پرنسپل صاحب سے سیر وتفریح کا تقاضا کیا جس کو پرنسپل صاحب نے منظور فرمایا اور طے ہوا کہ پہلگام کی سیر کے لئے جائیں گے۔ سنیچروار کو سبھی طلباء صبح سات بجے اسکول پہنچے اور سبھی طلباء اور اساتذہ نے اپنا اپنا سامان گاڑیوں میں رکھا۔ آخر کار گاڑیاں پہلگام کی طرف روانہ ہوئیں۔ راستہ میں کئی ایسی جگہیں آئیں جن میں آثار قدیمہ کے کچھ نشانیاں تھیں۔ ان پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے چلتے گئے۔ قصبہ پانپور دیکھا، ایک خوبصورت قصبہ ہے۔ جاتے جاتے ہمیں پانپور کے بعد اونتی پورہ، بجبہاڑہ، کھنہ بل اور کئی دوسرے قصبہ جات آئے ان کو دیکھتے گئے اور آخر پہلگام پہنچ گئے۔

پہلگام میرے لئے ایک نئی دنیا تھی۔ جب ہم سرینگر سے تقریباً 64 میل کا سفر طے کر کے بس سے اتر گئے تو میں وادی لدر کی یہ خوبصورت جگہ دیکھ

کر مبہوت رہ گیا۔ یہاں شیش ناگ اور کولاہائی گلیشیر سے دو نالے لے آکر ملتے ہیں،، اس خوبصورت جگہ میں بہت سے سیلانی ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ یہاں قدرت کی رنگینیاں دیکھ کر میں ایک نئی دنیا میں کھو گیا اور دل ہی دل میں اس جگہ کی داد دیتا رہا۔ یہاں چیل اور دیودار کے درختوں نے اس جگہ کے حسن کو اور دوبالا کر دیا تھا۔ ہم وہاں کچھ دیر رہے۔ میں نے وہ راستہ بھی دیکھا جہاں سے یاتری امرناتھ گپھا کی زیارت کیلئے جاتے ہیں۔ پہلگام اپنی خوبصورتی اور دلفریبی کی وجہ سے سب صحت افزاء مقامات سے افضل ہے۔

شام ہونے سے پہلے پہلے ہماری بسیں وہاں سے واپس روانہ ہوئیں۔ واپسی پر ہم نے مقامات کو پھر سے دیکھا جو پہلگام جاتے ہوئے ہم نے دیکھیں تھیں۔ یہ سفر میری زندگی کا سب سے یادگار سفر رہا۔

جانچ

سوال نمبر ا: ''سلک روٹ'' سبق کا ماحصل لکھئے۔

سوال نمبر ۲: شاہراہ ابریشم سے کس کس ملک سے کون کون سی چیزیں برآمد یا درآمد ہوتی تھیں؟

سوال نمبر ۳: تجارت اور برآمدات کے علاوہ شاہراہِ ابریشم کی کیا اہمیت تھی؟

سوال نمبر ۴: مارکو پولو نے شاہراہ ابریشم کے بارے میں کیا کہا ہے؟

سوال نمبر ۵: قدیم دنیا کی سب سے لمبی اور پراسرار شاہراہ کا نام بتایئے

سوال نمبر ۶: شاہراہ ابریشم کی لمبائی کتنی تھی؟

سوال نمبر ۷: شاہراہِ ابریشم سے کون کون لوگ گذرتے تھے؟

سوال نمبر ۸: شاہراہِ ابریشم پر موجودہ مختلف بستیوں کے نام لکھیے۔

کتابیات

ا۔ لداخ تہذیب وثقافت — عبدالغنی لداخی

۲۔ لداخ — وکی پیڈیا (انٹرنیٹ)

۳۔ لداخ — یوٹیوب

دعوت

رشید احمد صدیقی

تعارف:

انشائیہ کی صنف اردو میں انگریزی کی دین ہے۔انگریزی میں اسے ''ایسے'' کہتے ہیں۔انشائیہ وہ تحریر ہے جس میں کسی اہم یا غیراہم واقعے، کسی خیال، کسی جذبے یا محض کسی لمحاتی کیفیت کو پر لطف انداز میں پیش کر دیا گیا ہو۔ہماری نصابی کتاب میں درج سبق ''دعوت'' پروفیسر رشید احمد صدیقی کا لکھا ہوا ایک نمائندہ انشائیہ ہے۔مذکورہ انشائیہ اُن کی مشہور تصنیف ''خنداں'' سے ماخوذ ہے۔اس انشائیہ میں اُنہوں نے دعوت دینے والوں اور دعوت میں شریک ہونے والوں پر چوٹ کی ہے۔

مقاصد:

اس درسی مواد کے مطالعہ کے بعد درج ذیل مقاصد پورے ہونگے:

۱۔اردو کی صنف سخن انشائیہ سے طلاب واقف ہو جائیں گے۔

۲۔ مشہور انشائیہ نگار ادباء ،خاص طور پر رشید احمد صدیقی سے طلبا وطالبات واقف ہو جائینگے۔

۳۔انشائیہ کی ادبی اہمیت اور اسکے اثرات سے بھی طلبا وطالبات روشناس ہونگے۔

۴۔ طلاب دعوت کی اہمیت اور اسکے نام پر کی جانے والی فضول خرچیوں سے واقف ہونگے۔

۵۔وقت کی اہمیت اور اسے صحیح استعمال کرنے کی صلاحیت طلاب میں اجاگر ہوگی۔

آموزشی محاصل :

اس مضمون کے مطالعہ کے بعد طلبا وطالبات درج ذیل محاصل کے اہل ہیں:

۱۔ انشائیہ کی صنف سے بہرور طلاب اس پر بات کرتے ہیں۔

۲۔ اپنے کسی خیال کو آسانی سے انشائیہ میں تحریر کرتے ہیں۔

۳۔پروفیسر رشید احمد صدیقی کی حالت زندگی اور ان کی ادبی خدمات سے طلبا وطالبات واقف ہیں

۴۔دعوت سبق کے مرکزی خیال سے طلاب روشناس ہیں۔

۵۔اس باب میں استعمال کئے گئے الفاظ، محاورات اور دیگر قواعد اردو کو کہیں بھی استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ طلاب انشائیہ کے ارتقاء پر نوٹ لکھتے ہیں۔

موضوع کی تفصیل:

انشائیہ: انشائیہ کی صنف اردو میں انگریزی کی دین ہے۔انگریزی میں اسے ''ایسے'' کہتے ہیں۔انشائیہ وہ تحریر ہے جس میں کسی اہم یا غیر اہم واقعے، کسی خیال، کسی جذبے یا محض کسی لمحاتی کیفیت کو پر لطف انداز میں پیش کر دیا گیا ہو۔ترتیب، غور وفکر اور سنجیدگی وہ چیزیں ہیں جن کو یہ صنف برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ہلکا پھلکا خیال اور نرم ونازک ظرافت آمیز اظہار اسے زیب دیتا ہے۔انشائیہ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی کوئی شرط نہیں۔کوئی اصول

نہیں۔ جو کچھ کہو اسکو پڑھ کر قاری خوش ہو جائے۔ اسی لئے اس صنف کو انشائیہ نگار کی ذہنی ترنگ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس میں موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کا عنصر بھی ملتا ہے۔ لیکن یہ اس کے لئے ضروری نہیں۔ انشائیہ نگار کے لئے لازمی ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرنے کا گُر جانتا ہو۔ انشائیہ میں علم و حکمت کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کے بجائے زندگی کے عام تجربے کو شگفتگی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے کی دلچسپی قائم رہے۔

اردو میں انشائیہ کی مستحکم روایت موجود ہے۔ جن میں سرسید احمد خان (خوشامد) محمد حسین آزاد (نیرنگِ خیال) حسن نظامی (جھینگر کا جنازہ) مرزا فرحت اللہ بیگ (ایک وصیت کی تعمیل) رشید احمد صدیقی (ارہر کا کھیت) پطرس بخاری (کتّے) بہت ہی مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ادیبوں نے اس میدان میں کارنامے انجام دیئے، ان میں وزیر آغا، یوسف ناظم، شوکت تھانوی، شفیقہ فرحت، مجتبیٰ حسین اور مرزا محمد زماں آزردہ کامیاب انشائیہ نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

حالاتِ زندگی: پروفیسر رشید احمد صدیقی کی پیدائش جونپور میں 1896ء میں ہوئی۔ رواج کے مطابق آپ نے پہلے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر اسکول گئے اور باضابطہ تعلیم حاصل کی۔ جونپور میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد علی گڈھ چلے گئے جہاں پہلے اُردو میں ایم۔ اے کیا پھر فارسی میں۔ 1921ء میں رشید صاحب لکچرار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے واقعات ''آشفتہ بیانی میری'' میں بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کئے ہیں۔ 1932ء میں آپ کی شادی ہوگئی۔ 1935ء میں علامہ اقبالؔ نے اُنہیں اُردو ریڈر کے لئے منتخب کیا اور ترقی کرتے کرتے پروفیسر بنے۔ آپ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر بھی رہے ہیں۔ 1957ء آپ کو دہلی بلالیا گیا اور آپ کی تقرری بطور ڈائریکٹر جنرل ایجوکیشن کی گئی۔ ادبی خدمات کے سلسلے میں صدر جمہوریہ ہند نے آپ کو ''پدم شری'' کے اعزاز سے نوازا۔ آپ 1977ء میں وفات پا گئے۔

ادبی خدمات: رشید احمد صدیقی کو پروفیسر احتشام حسین نے اس دور کا سب سے بڑا مزاح نگار تسلیم کیا ہے۔ اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے 1963ء میں اُنہیں پدم شری کا اعزاز عطا کیا ہے۔ اُن کو ساہتیہ اکادمی کے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا ہے۔ مضامین رشید، خنداں، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسان رفتہ، جدید غزل اور آشفتہ بیانی میری اُن کی اہم تصانیف ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی طنز نگاری/طرزِ تحریر/ انشائیہ نگاری

رشید احمد صدیقی اُردو کے صاحبِ طرز انشاپرداز ہیں۔ اُن کی گنتی اُردو کے بہترین انشاپردازوں میں ہوتی ہے۔ رشید صاحب اُردو اور فارسی ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں علی گڑھ کی چھاپ ہے۔ طنز و مزاح کے میدان میں بھی ان کی حیثیت منفرد ہے۔ رشید صاحب زندگی کے عام واقعات کو ایک خاص ادبی رنگ میں اور اکثر ادبی اور علمی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ رشید صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اُن کے مضامین میں انوکھا پن، تازگی اور ادبی حسن ہے۔ اُن کے مضامین تاریخ و سیاست سے واقف لوگ زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ اُن کے خیال میں رومانیت پائی جاتی ہے۔ غالبؔ، اکبرؔ، اقبالؔ اور فانیؔ وغیرہ پر اُنھوں نے پُر وقار خیالات کا اظہار کیا ہے۔ رشید احمد کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین بہت ہی جاندار ہیں۔ ان کی نثر میں طنز کا پورا وار ہوتا ہے۔ اُن کے یہاں دلچسپ جملوں، معنی خیز اشاروں، برجستہ لطیفوں اور پُر لطف اندازِ بیان کی وجہ سے ادبی شان پائی جاتی ہے۔ ان کے بہترین مضامین میں ''ہوٹل میں ریڈیو''، ''سفر''، ''دعوت''، ''باغ''، ''امتحانات''، ''گواہ''، ''الیکشن''، '' ارہر کا کھیت'' وغیرہ شامل ہیں۔

نصابی سوالات

سوال: ''دعوت'' انشائیہ کے درج ذیل جملوں پر غور کر کے لکھیے، دعوت دینے والوں اور دعوت میں شریک ہونے والوں پر کس کس طرح سے چوٹ کی گئی ہے۔

(**الف**) ہمارے سامنے بھی افطاری رکھ دی گئی۔ ابھی ہم سب نے مشکل سے دو ایک لقمے فرو کیے ہوں گے کہ ایک حملہ ہوا، چند سُورما ہم پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ سامنے تھا اُسے چٹ کر کے آگے بڑھ گئے۔

جواب: مذکورہ عبارت میں رشید احمد صدیقی نے دعوت میں شریک ہونے والوں پر چوٹ کرتے ہوئے اُس دعوت کا حال بیان کیا ہے جب رمضان کے مہینے میں اُن کو ایک دعوت میں جانے کا موقع ملا تو افطار کے وقت افطاری اُن کے سامنے رکھ دی گئی۔ جب اُنھوں نے صرف ایک دو نوالے کھائے تھے تو دعوت میں شریک کچھ بہادر اُن پر ٹوٹ پڑے اور جو کچھ اُن کے سامنے کھانے کے لئے رکھا گیا تھا وہ اُسے کھا گئے جیسے وہ زندگی بھر کے بھوکے تھے۔

(**ب**) 'تیسری مصیبت یہ کہ جو کھانا پیش کیا جارہا تھا اس کے دوسرے عزیز و اقارب نہ معلوم کون کون اور تھے جن کی عدم موجودگی میں کھانے کو ہاتھ لگانا بڑا گنوارپن ہوتا'

جواب: مذکورہ عبارت میں رشید احمد صدیقی نے دعوت دینے والوں پر طنز کرتے ہوئے اُس دعوت کا حال لکھا ہے جس میں پُر تکلف کھانوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پکوانوں کی تعداد اتنی تھی کہ شمار کرنا مشکل تھا اور جب تک سارے پکوان کھانے کی میز پر نہیں آجاتے تب تک کسی پکوان کو ہاتھ لگانا بڑا گنوارپن سمجھا جاتا تھا۔

(**ج**) 'مشکل یہ ہے کہ کافی سے انکار کیجئے تو بعض میزبان اس طور پر خفا ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ بعض دعوتوں میں عجیب عجیب قسم کے بدتمیزوں سے سابقہ پڑتا ہے۔

جواب: مذکورہ عبارت میں رشید احمد صدیقی اُن دعوت دینے والوں پر چوٹ کی ہے جو کھانے کے ساتھ بے مزہ کافی زبردستی مہمان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اگر مہمان انکار کرے تو وہ خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہیں۔ بقول رشید احمد صدیقی کچھ دعوتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جہاں عجیب اور بیوقوف لوگوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔

سوال: درج ذیل عنوانات پر مضامین لکھئے۔

کشمیر میں موسم سرما　　　　جمہوریت کی افادیت

کشمیر میں موسم سرما

کشمیر میں جاڑا یعنی سردی کا موسم نومبر کے مہینے میں شروع ہوتا ہے۔ صبح اور شام کو ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ بعض اوقات بارشیں ہونے لگتی ہیں اور اُن کے ساتھ برف باری بھی ہوتی ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ موسم جس کے انتظار میں لوگ ہوتے ہیں، آہی جاتا ہے اور زندگی پر چھا جاتا ہے۔

دسمبر کے مہینے میں ہوائیں شدید طور پر سرد ہونے لگتی ہیں اور عام طور پر آسمان ابر آلود دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑی مقام پر برف باری ہونے لگتی ہے اور اس کا اثر وادی کے میدانی علاقوں پر بھی ہوتا ہے اور بارش کے ساتھ برف کے سفید سفید گولے دکھائی دیتے ہیں دولت مند تو اس حال میں بھی دل بہلاتا ہے مگر ایک غریب اور مفلس کے لئے دُکھ درد کا پیغام آتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو موسم سرما کشمیریوں کو مفلس بنا دیتا ہے۔ لکڑی کوئلے اور دوسری ضروریات زندگی جو کم سرد علاقے میں رہنے والے لوگوں کو ضرورت نہیں ہوتی ہیں ان کو کافی روپیہ خرچ کر کے خریدنا پڑتی ہے۔

بہر حال سردی ان کی صحت پر بھی بُرا اثر ڈالتی ہے اور کمزور لوگ بے وقت موت کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ ان ایام میں کشمیر کے لوگوں کو زکام کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ تقریباً تمام سرکاری دفاتر جموں منتقل ہو جاتے ہیں اور کشمیر کی وادی ویران سی لگتی ہے۔ نہ باغوں میں چہل پہل نہ بازاروں میں رونق۔ کاروبار پھیکا پڑ جاتا ہے۔ مزدور بے کار ہو جاتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں بھی شدید سردی ہوتی ہے مگر سائنس کی ترقی کی وجہ سے اُنہوں نے ایسا سامان فراہم کر رکھا ہے کہ وہ کوئی دقت محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے یہاں جب برف جم جاتی ہے تو زندگی بیکار بن جاتی ہے۔ اس میں جمود آ جاتا ہے اور اس کا اثر عوام کی معاشرت پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ ایک فطرت پرست برف باری کے نظارے سے حظ حاصل کرتا ہے۔ وہ لوگ پہاڑی علاقوں پر جا کر اسکیٹنگ کرتے ہیں۔

غرض جاڑے کا موسم کشمیر میں آفت برپا کر دیتا ہے اور لوگوں کی اقتصادی حالت مجموعی طور پر بہت بُری ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ تباہ حال ہو جاتے ہیں اور زندگی سنوارنے میں ان کو دقت محسوس ہو جاتی ہے۔

جمہوریت کی افادیت

آج کا عہد جمہوریت کا عہد ہے۔ جمہوریت سے ہماری مُراد اس طرز حکومت سے ہے جس میں حکومت کی باگ ڈور عوام کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ عوام بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر حکومت کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ عوام کے نمائندے ودھان سبھاؤں میں قوانین بناتے ہیں۔ وہ مکمل طور پر عوام کی بھلائی اور فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر کوئی نمائندہ ٹھیک طور پر کام نہ کرے تو عوام ایسے نمائندے کو اس عہدے سے ہٹا سکتے ہیں۔ حقیقت میں جمہوریت عوام کی حکومت ہے جسے عوام کے لئے عوام کے منتخب ممبران کے وساطت سے چلایا جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ہندوستان اور یونان میں جمہوریت کی نشو و نما ہوئی۔ سیاسیات میں پرانی سوسائٹیوں میں جمہوریت کے معنی سمجھنے کے لئے یونان کی مثال مناسب رہے گی، وہاں غلاموں کو سیاسی حقوق میسر نہیں تھے لیکن ان کے مالکوں کا حکومت میں پورا تعاون تھا اور انہیں سبھی سیاسی حقوق حاصل تھے۔ اِس طرح اس وقت جمہوری حکومت کے معنی مختلف تھے۔ تب یہ جمہوریت برابری اور یکسانیت کی بنا پر مبنی نہیں تھی۔

جمہوری نظام میں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ انسان اپنے ووٹ کے حقوق کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس طرح کے نظام حکومت میں سبھی مذاہب کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ ناخواندگی، اقتصادی نابرابری، فرقہ پستی، خود غرضی، سماجی برائیاں اور سیاسی پارٹیوں کی خامیاں ایسے عناصر ہیں جن سے جمہوریت کے راستے میں رکاوٹیں آتی ہیں۔

جانچ:

سوال: صحیح جواب چُن لیجئے۔

(ا) میر امّن نے ''قصہ چہار درویش'' کا جو ترجمہ کیا ہے، اُس کا نام ہے:

ایک کہانی، باغ و بہار، نوطرزِ مُرصع

(ب) رشید احمد صدیقی پیدا ہوئے:

۱۸۹۶ء میں، ۱۹۰۷ء میں، ۱۹۷۷ء میں

(ج) فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ اُردو کے سربراہ تھے:

ڈاکٹر ویکفیلڈ، ڈاکٹر جان گلکراسٹ، ڈاکٹر انسٹ

(د) ''دعوت'' کے مصنف ہیں:

فرحت اللہ بیگ، عبدالحلیم شرر، رشید احمد صدیقی

درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھئے:

۱۔ دعوت انشائیہ کے من پسند کردار پر پانچ جملے لکھئے۔

۲۔ رشید صدیقی کہاں اور کب پیدا ہوئے؟

۳۔ دعوت انشائیہ میں کس کس کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے؟

۴۔ رشید صدیقی کی دو کتابوں کے نام بتائیے۔

کتابیات

۱۔	انشائیہ اور انشائیے	محمد حسن
۲۔	انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں	انور سدید
۳۔	مضامینِ رشید	رشید احمد صدیقی
۴۔	اردو ادب میں طنز و مزاح	وزیر آغا

گدڑی کا لال نور خان

مولوی عبدالحق

تعارف:

خاکہ نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے۔خاکہ کوانگریزی میں اسکیچ(SKETCH) کہا جاتا ہے۔اردو میں خاکہ کے لئے مرقع اور قلمی تصویر کی اصطلاحیں بھی استعمال کی جاتی ہے۔خاکہ سے مراد ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح ابھارے جائیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں اجاگر ہوں۔اس طرح ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے سامنے نمودار ہوتی ہے۔زیرنظر باب کا مصنف بابائے اُردو مولوی عبدالحق 20 /اگست 1870ءکو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے علی گڑھ کالج سے بی۔اے پاس کیا۔آپ کی قابلیت اور ذہانت کے نتیجے میں الہ آباد یونیورسٹی نے ایل۔ایل۔ڈی اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دے کر آپ کی مجموعی خدمات کا اعتراف کیا۔"گدڑی کا لال نورخاں"پڑھ کر نورخان کی شخصیت پر مصنف کی فنی مہارت اور کمال کا پتہ چلتا ہے۔

مقاصد:

اس درسی مواد کے مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل مقاصد پورے ہونگے۔

ا۔ فن خاکہ نگاری سے طلاب بہ خوبی واقف ہونگے۔

۲۔خاکہ نگار مولوی عبدالحق کے احوال وکوائف اور ادبی خدمات سے طلاب روشناس ہونگے۔

۳۔اس مضمون میں استعمال کئے گئے ذخیرہ الفاظ،محاورات اور قواعد وغیرہ کا طلاب استفادہ کرسکیں گے۔

۴۔سماجی مسائل اور نابرابری کے موضوعات پر مباحثہ کرنے کے طلاب اہل ہونگے۔

آموزشی ماحصل:

اس درسی مواد کے مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل محاصل کے اہل ہیں:

ا۔ فن خاکہ نگاری سے طلاب بہ خوبی واقفیت رکھتے ہیں۔

۲۔خاکہ نگار مولوی عبدالحق کے احوال وکوائف اور ادبی خدمات سے طلاب روشناس ہیں۔

۳۔اس مضمون میں استعمال کئے گئے ذخیرہ الفاظ،محاورات اور قواعد وغیرہ کا طلاب استعمال کرتے ہیں۔

۴۔سماجی مسائل اور نابرابری کے موضوعات پر طلاب مضمون لکھتے ہیں۔

موضوع کی تفصیل:

خاکہ

خاکہ نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے۔خاکہ کوانگریزی میں اسکیچ(SKETCH) کہا جاتا ہے۔اردو میں خاکہ کے لئے مرقع اور قلمی تصویر کی اصطلاحیں بھی استعمال کی جاتی ہے۔خاکہ سے مراد ایک ایسی نثری تحریر ہے جس میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح ابھارے جائیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں اجاگر ہوں۔اس طرح ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے سامنے نمودار ہوتی ہے۔

خاکہ نہ سیرت نگاری ہے نہ سوانح عمری۔ یہ کسی دل آویز شخصیت کی دھندلی تصویر ہے۔اس میں نہ زندگی کے اہم واقعات کی گنجائش ہے نہ خاص تاریخوں کی۔مصنف نے کسی شخص میں کچھ قابلِ ذکر خصوصیات دیکھی ہوں اور وہ انھیں دلچسپ انداز سے بیان کردے،تو یہی خاکہ ہے۔خاکہ میں غیر جانبدارنہ طریقہ کار اپنانا لازمی ہے ورنہ خاکہ تعریفوں کا گلدستہ یا خامیوں کا پلندہ بن جائیگا۔اس میں خوبیوں اور خامیوں دونوں کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔خاکہ لکھنے کا واحد مقصد اپنی پسندیدہ شخصیت کی ایسی تصویر کشی کرنا ہے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ میں اس کو برسوں سے جانتا ہوں۔کامیاب خاکہ میں زبان و بیان کا بے تکلفی اور برجستگی کا بھر پور اظہار ہو۔تاکہ پڑھنے والا لطیف مزاح کی چاشنی سے لطف اندوز ہو سکے۔

اردو میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ سے ہوا۔انھوں نے نذیر احمد کا خاکہ لکھ کر اردو میں خاکہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔اس کے علاوہ بہت سے ادیب خاکہ لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔اس طرح کئی خاکوں کے مجموعے منظرِ عام پر آئے۔جن میں مرزا فرحت اللہ بیگ (دلی کا یادگار مشاعرہ) مولوی عبدالحق (چند ہم عصر) رشید احمد صدیقی (گنج ہائے گراں مایہ) شوکت تھانوی (شیش محل) سعادت حسن منٹو (گنجے فرشتے) وغیرہ مجموعے بہت ہی مشہور ہیں۔موجودہ دور میں جنھوں نے کامیاب خاکے لکھے۔ان میں مشتاق یوسفی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی عبدالحق حالاتِ زندگی:

بابائے اُردو مولوی عبدالحق 20 ر اگست 1870ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے علی گڑھ کالج سے بی۔اے پاس کیا۔زمانۂ تعلیم ہی میں آپ کو سرسید، حالی، محسن الملک جیسے عالموں کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔بی۔اے کرنے کے بعد آپ کو مختلف عہدوں پر فائز ہونے کا موقع ملا، جن میں مدرس (حیدرآباد)، انسپکٹر مدارس (حیدرآباد)، سکریٹری انجمن ترقی اُردو، صدر اور پروفیسر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، مدیر سہ ماہی ادبی رسالہ ''اُردو'' وغیرہ اہم ہیں۔

آپ کی قابلیت اور ذہانت کے نتیجے میں الہ آباد یونیورسٹی نے ایل۔ایل۔ڈی اور علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دے کر آپ کی مجموعی خدمات کا اعتراف کیا۔تقسیم ملک کے بعد آپ کراچی چلے گئے اور وہیں 16 ر اگست 1961ء کو انتقال کر گئے۔

ادبی کارنامے: اُردو ادب میں قدیم کتابوں کی تدوین، ترتیب اور اشاعت کا کام آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔اس کے علاوہ آپ کی تصنیفات اُردو ادب کا بیش قیمتی سرمایہ ہے، جن میں تنقیداتِ عبدالحق، مقدماتِ عبدالحق، چند ہم عصر، خطبات عبدالحق، اُردو قواعد اور انگلش اُردو ڈکشنری بہت ہی اہم ہیں۔

طرزِ تحریر: مولوی عبدالحق ایک محقق، سوانح نگار، زبان دان، لغت نویس، قواعد دان اور صاحب طرزِ انشا پرداز تھے۔آپ کی تحریروں پر حالی کا سب سے زیادہ اثر ہے۔آپ کا اسلوب سادہ، رواں اور سلیس ہے۔آپ اکثر ہندی کے الفاظ نہایت خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔خشک علمی موضوعات پر بھی آپ کی تحریر سادہ اور عام فہم ہوتی ہیں۔آپ مشکل زبان لکھنے والوں کو اُردو کا دشمن کہتے تھے اور آسان زبان لکھنے پر زور دیتے تھے۔

نصابی سوالات

سوال: ''گدڑی کا لال نور خاں'' پڑھ کر نور خان کی شخصیت کے بارے میں ایک مضمون لکھئے۔

جواب: نور خاں مرحوم اول رسالے میں سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔وہ ایک غریب خاندان سے تھے۔مگر وہ سچائی اور فرض شناسی اور قابلیت کے بل بوتے پر ترقی کرتے گئے۔وہ ڈرل انسٹرکٹر تھے اور نئے بھرتی ہونے والے گوروں کو ڈرل سکھاتے تھے۔وہ بڑے شہسوار تھے۔منہ زور گھوڑوں کو سدھارنے میں وہ کمال رکھتے تھے۔خان صاحب بے حد خوددار اور کافی ذہین تھے۔کسی کی ترچھی نظر بھی گوارا نہ کر سکتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ دفعداری سے

آگے نہ بڑھ سکے۔ کرنل اسٹورٹ بھی ان پر بہت مہربان تھے اور وہ اس کی خودداری، سچائی اور فرض شناسی سے بہت خوش تھے۔ خاں صاحب قانون اور اس کے فرض کے اس قدر پابند تھے کہ اس ضمن میں بڑے بڑے افسروں کا لحاظ نہ کرتے۔ سچائی خان صاحب کی فطرت اور سرشت میں تھی۔ جان بے شک چلی جائے مگر وہ کبھی سچائی سے منہ نہیں موڑتے تھے۔ مستعد اس قدر تھے کہ جوان بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ دوستی کے پکے اور بڑے ہی وضعدار تھے۔ غریبوں کی مدد کرتے۔ حد درجہ مہمان نواز تھے۔ خودداری ان کی رگ و پے میں سمائی تھی۔ میٹھا کھانا ان کو پسند تھا۔ پرلے درجے کے زندہ دل اور خوش طبع انسان تھے۔ دیانت اور امانت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ حساب کے کھرے تھے اور ایک ایک کوڑی کا حساب رکھتے تھے۔ ان کے دل میں خلوص اور سچائی کا جذبہ تھا۔ وہ بڑے نیک دل، مرنجاں مرنج اور جفاکش تھے۔

سوال: اوپر دئے گئے اقتباس کا ماحصل لکھئے۔

جــواب: اس اقتباس کا ماحصل یہی ہے کہ انسان کو ہر حالت میں قوانین کی پاسداری کرنی چاہیے۔ ایک انسان ہر جگہ اپنی طبیعت کی زندگی نہیں گزار سکتا ہے۔ چاہیے وہ کوئی بڑا افسر ہی کیوں نہ ہو، قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ اس لئے اس کا احترام سب پر واجب ہے۔ قانون شکنی جرم ہے اور اس کی اجازت کوئی کسی کو نہیں دے سکتا۔ اپنے فرائض کو انجام دینا ہر حالت میں ضروری ہے۔

سوال: لارڈ کرزن نے جلتا ہوا سگریٹ کیوں پھینک دیا؟

جواب: لارڈ کرزن جس جگہ سگریٹ دان نکال کر سگریٹ سلگانا چاہتے تھے وہاں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی چونکہ نور وہاں اپنے فرائض انجام دینے کے لئے تعینات تھے جب اُنہوں نے لارڈ کرزن کو یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا تو اُنہوں نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ فوجی سلامی دے کر لارڈ کرزن سے کہا کہ یہاں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔ تو اُنہوں نے سگریٹ پھینک دیا۔

سوال: عہدیداروں کا رنگ کیوں فق ہو گیا؟

جواب: جب نور خان جیسے معمولی سپاہی نے لارڈ کرزن جیسے اہم عہدیدار کو سگریٹ پینے سے منع کر دیا تو عہدیداروں کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

سوال: مصنف نے کیوں کہا ہے؟ ''کاش ہم میں بہت سے نور خان ہوتے!''

جــواب: نور خان کی شخصیت، سیرت، سچاہی، دیانت داری، خوداری، فرض شناسی اور وضعداری سے متاثر ہو کر مصنف نے یہ تمنا کی کی کاش ہم میں بہت سے نور خان ہوتے۔

سوال: مصنف نے کیوں کہا ہے؟ ''اچھا انسان ہونے میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں ہے۔''

جــواب: نور خان عہدے کے لحاظ سے ایک معمولی سپاہی تھا۔ دنیاداری کے لحاظ سے بھی وہ ایک معمولی انسان تھا۔ لیکن قدرت نے اُس کو ایمانداری، صاف گوئی، زندہ دلی اور نیک نفسی جیسے عظیم صفات سے مالا مال کر دیا تھا۔ اس لئے ایک اہم شخصیت کا مالک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف نہ کہا کہ اچھا انسان ہونے میں غریب اور امیر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ اچھائی اور نیکی کسی ایک انسان کی جاگیر نہیں ہے۔

جانچ:

درجِ ذیل عبارت کو پڑھ کر آخر پر دیے گئے سوالات کے جواب لکھئے

"کرنل اسٹورٹ بھی ان پر بہت مہربان تھے اور وہ اس کی خودداری، سچائی اور فرض شناسی سے بہت خوش تھے۔ خاں صاحب قانون اور اس کے فرض کے اس قدر پابند تھے کہ اس ضمن میں بڑے بڑے افسروں کا لحاظ نہ کرتے۔ سچائی خان صاحب کی فطرت اور سرشت میں تھی۔ جان بے شک چلی جائے مگر وہ کبھی سچائی سے منہ نہیں موڑتے تھے۔ مستعد اس قدر تھے کہ جوان بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ دوستی کے پکے اور بڑے ہی وضعدار تھے۔ غریبوں کی مدد کرتے۔ حد درجہ مہمان نواز تھے۔ خودداری ان کی رگ و پے میں سمائی تھی۔ میٹھا کھانا ان کو پسند تھا۔ پرلے درجے کے زندہ دل اور خوش طبع انسان تھے۔ دیانت اور امانت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ حساب کے کھرے تھے اور ایک ایک کوڑی کا حساب رکھتے تھے۔ ان کے دل میں خلوص اور سچائی کا جذبہ تھا۔ وہ بڑے نیک دل، مرنجاں مرنج اور جفاکش تھے۔"

سوالات

ا۔ نور خان کیسے انسان تھے؟

۲۔ وہ کس چیز کے کھرے تھے؟

۳۔ اُن کو کس قسم کا کھانا پسند تھا؟

۴۔ یہ اقتباس کس سبق سے لیا گیا ہے؟

۵۔ اس اقتباس سے پانچ اسم اور پانچ فعل تلاش کیجئے۔

درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھئے:

ا۔ مولوی عبدالحق کو کن کن ناموں سے جانا جاتا ہے؟

۲۔ مولوی عبدالحق نے کس کس عہدے پر نوکری کی اور کس عہدے پر کہاں سبکدوش ہوئے؟

۳۔ نور خان کیسے آدمی تھے؟

کتابیات

ا۔	اردو میں خاکہ نگاری	ڈاکٹر صابرہ سعید
۲۔	اردو کے بہترین شخصی خاکے	مبین مرزا
۳۔	مولوی عبدالحق فن اور شخصیت	ڈاکٹر معراج نیر
۴۔	آئینہ اردو	پروفیسر جوہر قدوسی
۵۔	اردو کی ادبی تاریخ	پروفیسر عبدالقادر سروری

محلے کی ہولی

ڈرامہ (اطہر پرویز)

تعارف:

ڈراما ادب کی سب سے قدیم صنف ہے۔ ہندوستان اور یونان دنیا کے وہ دو ملک ہیں جہاں ڈرامے نے پہلے پہل آنکھیں کھولیں۔ چناچہ ڈرامے کے اصول بھی سب سے پہلے یہی زیرِغور آئے۔ بھرت منی نے ہندوستان میں اور ارسطو نے یونان میں ڈرامے کے مسائل پر غور کیا۔ ڈراما الفاظ سے نہیں بلکہ عمل سے بنتا ہے۔ بیسویں صدی کے وسط میں سائنسی ترقی کی وجہ سے ڈرامے کو بہت فروغ ملا۔ جس میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا خاص رول رہا۔ ''محلے کی ہولی'' بھی ایک ڈراما ہے جس کو اطہر پرویز نے لکھا ہے۔ اطہر پرویز 1922ء کو الٰہ آباد سیلوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ابتدائی تعلیم پہلے مدرسہ میں ہوئی جہاں اُردو کے ساتھ ساتھ قرآن شریف، گلستان اور بوستان پڑھی۔ الٰہ آباد میں کرسچین کالج سے ایف اے پاس کرنے کے بعد 1941ء میں علی گڑھ آئے۔ 1958ء میں اُردو میں ایم۔ اے کیا اور 1959ء میں جنرل ایجوکیشن میں لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' اطہر پرویز کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ڈرامہ قومی وحدت اور بھائی چارے کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مقاصد:

اس درسی مواد کے مطالعہ کے بعد مندرجہ ذیل مقاصد پورے ہونگے۔

۱۔ ڈراما کے فن سے طلاب بہ خوبی واقف ہونگے۔

۲۔ ڈراما نگار ''اطہر پرویز'' کے احوال وکوائف اور ادبی خدمات سے طلاب روشناس ہونگے۔

۳۔ اس مضمون میں استعمال کئے گئے ذخیرہ الفاظ، محاورات اور قواعد وغیرہ کا طلاب استفادہ کریں گے۔

۴۔ سماجی مسائل، قومی وحدت اور بھائی چارے کے جذبات کی عکاسی طلاب کریں گے۔

آموزشی ماحصل:

اس درسی مواد کے مطالعہ کے بعد طلاب درج ذیل ماحصل کے قابل ہیں۔

۱۔ ڈراما کے فن سے طلاب بہ خوبی واقف ہیں۔

۲۔ ڈراما نگار ''اطہر پرویز'' کے احوال وکوائف اور ادبی خدمات سے طلاب روشناس ہیں۔

۳۔ اس مضمون میں استعمال کئے گئے ذخیرہ الفاظ، محاورات اور قواعد وغیرہ کا طلاب استفادہ کرتے ہیں۔

۴۔ سماجی مسائل، قومی وحدت اور بھائی چارہ کی ان گنت خوبیوں سے بہرہ ور ہیں۔

موضوع کی تفصیل:

ڈراما ادب کی سب سے قدیم صنف ہے۔ ہندوستان اور یونان دنیا کے وہ دو ملک ہیں جہاں ڈرامے نے پہلے پہل آنکھیں کھولیں۔ چناچہ ڈرامے کے اصول بھی سب سے پہلے یہی زیرِغور آئے۔ بھرت منی نے ہندوستان میں اور ارسطو نے یونان میں ڈرامے کے مسائل پر غور کیا۔ ڈراما الفاظ سے نہیں بلکہ عمل سے بنتا ہے۔ اسی لئے ارسطو نے ڈرامے کو عمل کی نقل کہا ہے۔ ڈراما زندگی کی ایسی نقل ہے۔ جو اداکاروں کے ذریعے دیکھنے والوں کے سامنے اسطرح پیش کی جاتی ہیں کہ یہ بالکل سچی اور اصلی معلوم ہو۔ تکنیکی طور پر ڈرامے میں تین چیزیں پلاٹ، کردار نگاری اور زبان وبیان ہونا لازمی ہے۔ واقعات کی ترتیب اس طرح ہو کہ ہر نیا واقعہ پرانے واقعہ کا حصّہ لگے۔ کردار نگاری کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر کردار کی نفسیات کا خاص خیال رکھ کر ہی مکالمے ادا کئے

جائیں۔کردار کی عمر، طبقے، تعلیم وتربیت اور خاندانی امور کا لحاظ رکھا جائے۔تاکہ دیکھنے والے پر گہرا اثر ہوسکے۔زبان و بیان کے اعتبار سے ایجاز و اختصار ڈراما کا روح ہے۔

دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو میں بھی ڈراما کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہیں۔اس کا آغاز لکھنو کے مشہور شہر اودھ کے حکمران واجد علی شاہ کے ہاتھوں 1824ء میں ''رادھا کنیا کا قصّہ'' سے ہوا۔اس ڈراما کے بعد ہی امانت لکھنوی نے شہرہ آفاق ڈراما ''اندر سبھا'' لکھ کر دوام حاصل کیا۔ڈرامے کی مقبولیت اتنی بڑھی کہ ڈراموں کی کمپنیاں اپنے ساز وسامان کے ساتھ ملک کے مختلف علاقوں میں جا کر ڈرامے اسٹیج کرنے لگے۔اس دور میں جو ڈراما نگار سامنے آئے،ان میں احسن لکھنوی (چندرولی) طالب بنارسی (لیل ونہار) آغا حشر کاشمیری (اسیر حرص) امتیاز علی تاج (انارکلی) بہت مشہور ہوئے۔

بیسویں صدی کے وسط میں سائنسی ترقی کی وجہ سے ڈرامے کو بہت فروغ ملا۔جس میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا خاص رول رہا۔ساتھ ہی ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے اثرات بھی ڈرامے پر پڑے۔جس سے ایپک تھیٹر اور لایعنی ڈرامے وجود میں آئے۔اس دور میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، احمد عباس، عصمت، علی محمد لون وغیرہ قابلِ ذکر ڈراما نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

اطہر پرویز

حالاتِ زندگی: اطہر پرویز 1922ء کو الہ آباد سیلوہارہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔اُن کی ابتدائی تعلیم پہلے مدرسہ میں ہوئی جہاں اُردو کے ساتھ ساتھ قرآن شریف، گلستان اور بوستان پڑھی۔الہ آباد میں کرسچین کالج سے ایف اے پاس کرنے کے بعد 1941ء میں علی گڑھ آئے۔یہاں سے 1945ء میں فارسی میں ایم۔اے پاس کیا۔یونیورسٹی چھوڑتے ہی سیاسی زندگی اختیار کی اور صوبہ متوسط میں کئی سال قیام رہا۔1950ء تک کل وقتی سیاسی کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔اسی دوران جیل کی زندگی بھی گزاری اور زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔1950ء میں دہلی آگئے اور جامعہ کے بچوں کے رسالے ''پیام تعلیم'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔1956ء میں وہاں سے مستعفی ہو کر علی گڑھ آ گئے۔1958ء میں اُردو میں ایم۔اے کیا اور 1959ء میں جنرل ایجوکیشن میں لیکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔10 / مارچ 1984ء کو علی گڑھ میں انتقال کر گئے۔

ادبی کارنامے: اطہر پرویز نے بچوں اور کم پڑھے لکھے بالغوں کے لیے متعدد کتابیں لکھیں۔جن میں سے آٹھ کتابوں پر حکومت ہند نے انعامات دیے ہیں۔بڑوں کے لیے ادب سے متعلق ایک کتاب ''ادب کا مطالعہ'' پر حکومت اتر پردیش سے انعام ملا اور یہ کتاب مختلف درسگاہوں میں نصاب کے طور پر رائج ہے۔انہوں نے تقریباً دو درجن کتابیں لکھی ہیں۔اطہر پرویز کو ڈراموں سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔متعدد ڈرامے لکھے جو وقتاً فوقتاً اسٹیج ہوتے رہتے ہیں۔فسانہ عجائب کو بھی ترتیب دیا ہے۔بلاشک اطہر پرویز اُردو کے ایک بلند پایہ ادیب ہیں۔

ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' کا خلاصہ:

ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' اطہر پرویز کا لکھا ہوا ہے۔یہ ڈرامہ قومی وحدت اور بھائی چارے کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔اس کے کرداروں میں سوتر دھار، نٹی، لالہ تیج رام، شہباز خان، سوشیلا، خالدہ، لالہ تیج رام کی بیوی، میر صاحب، حافظ جی، پنڈت جی، ٹھاکر گوبند رام، پنڈت رام سرن، محمود میاں وغیرہ کئی کردار شامل ہیں مگر اس میں لالہ تیج رام اور شہباز خان دو دوستوں کو ہی مرکزی اہمیت حاصل ہے۔یہ ان کی گہری دوستی اور پھر اس میں ناراضگی کے محور پر گھومتا ہے۔

لالہ تیج رام اور شہباز خان کے درمیان بڑی گہری دوستی ہوتی ہے۔دونوں کے گھر ایک دوسرے کے آس پاس ہوتے ہیں اور گھر والوں میں بھی بڑے اچھے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔کبھی شہباز خان کی بیٹی خالدہ لالہ تیج رام کیلئے بنیان بنتی ہے تو کبھی لالہ تیج رام کی بیوی اچار بنا کر شہباز خان کے سارے کنبے کو کھلاتی ہے۔مگر اس دوستی میں اس وقت دراڑ پڑنا شروع ہو جاتی ہے جب شہباز خان کا چھپا ہوا دشمن میر صاحب لالہ تیج رام کو الٹی سیدھی باتیں بتا کر

شہباز خان کے خلاف بھڑکاتا ہے دونوں ایک دوسرے کی صورت سے بھی بے زار ہو جاتے ہیں۔ایک دوسرے سے بات چیت بھی بند کرتے ہیں اور گھریلو تعلقات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔غرض میر صاحب کی لگائی ہوئی آگ میں سب کچھ جلتا ہے۔اسی دوران ہولی کے تہوار کے موقعے پر لالہ تیج رام سب سے چندہ لے کر صرف شہباز خان کو الگ کر لیتے ہیں۔شہباز خان اس بات پر کافی غم و غصے کا اظہار کرتے ہیں مگر لالہ تیج رام ان سے چندہ لینے سے انکار پر ڈٹے رہتے ہیں بالآخر محلے کے بڑے بزرگ مل کر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ شہباز خان سے چندہ کی بجائے لکڑی لی جائے اور یہ جھگڑا ختم کیا جائے۔لیکن رات گئے لکڑی کا ملنا ممکن نہ تھا۔شہباز خان غصہ ہو کر جاتے ہیں اور گھر سے لکڑی کی کرسیاں، میز اور دروازے وغیرہ توڑ لاکر سب کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔یہ دیکھ کر سب کو بہت دُکھ ہوتا ہے کہ شہباز خان نے قیمتی چیزیں توڑ کر اپنا بہت نقصان کیا ہے اور لالہ تیج رام کا دل بہت دکھی ہوتا ہے اور آنکھیں بھر آتی ہے۔وہ تمام شکایتیں بھول کر شہباز خان سے گلے ملتے ہیں۔دونوں دوستوں کی ہر غلط فہمی ہولی کی آگ میں جل کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔یہ ڈرامہ قومی وحدت اور بھائی چارے کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں سبھی مذاہب کے لوگ مل جل کے رہتے ہیں۔ایک دوسرے کے تہواروں میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔آپس میں اخوت اور اتفاق ہے۔لیکن ملک میں موجود کچھ ایسے عناصر ہیں جو اس بھائی چارے میں پھوٹ ڈال کر ملک کے امن و امان کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ایسے ملک دشمن عناصر لوگوں سے خبردار رہ کر اُن کو اس برے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔

لالہ تیج رام ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' کے دو مرکزی کرداروں میں سے ایک کردار کا نام ہے۔وہ شہباز خان کے دوست اور ہمسایہ ہیں۔وہ شہباز خان اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات بنائے رکھتے ہیں۔وہ محلے کی ہولی کمیٹی کے سیکریٹری کا فرض بھی کئی برسوں سے نبھاتے آرہے ہیں۔اپنی بیٹی سوشیلا کی طرح وہ شہباز خان کی بیٹی خالدہ سے بھی برابر محبت کرتے ہیں اور اس کی ضد پر اس کی بنائی ہوئی سوئیٹر پہننے پر راضی ہوتے ہیں۔

میر فراست علی جب لالہ تیج رام اور شہباز خان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو لالہ تیج رام کی طبعیت نہ چاہتے ہوئے بدلنے لگتی ہے۔وہ میر صاحب کے غلط ارادے کو پہچان نہیں پاتے اور اپنے دوست شہباز خان سے بہت ناراض رہتے ہیں اور تعلق بھی توڑتے ہیں یہاں تک کہ ان سے ہولی کیلئے چندہ بھی نہیں لیتے۔مگر ان کے اندر کا نرم دل انسان اس وقت سامنے آتا ہے جب شہباز خان گھر سے قیمتی سامان توڑ کر لاتے ہیں۔ان کا دل بھر آتا ہے اور وہ ساری دشمنی بھول کر اپنے پرانے دوست سے گلے ملتے ہیں۔

نصابی سوالات

سوال : لالہ تیج رام کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

جواب: لالہ تیج رام ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' کے دو مرکزی کرداروں میں سے ایک کردار کا نام ہے۔وہ شہباز خان کے دوست اور ہمسایہ ہیں۔وہ شہباز خان اور اس کے گھر والوں کے ساتھ ہمیشہ اچھے تعلقات بنائے رکھتے ہیں۔وہ محلے کی ہولی کمیٹی کے سیکریٹری کا فرض بھی کئی برسوں سے نبھاتے آرہے ہیں۔اپنی بیٹی سوشیلا کی طرح وہ شہباز خان کی بیٹی خالدہ سے بھی برابر محبت کرتے ہیں اور اس کی ضد پر اس کی بنائی ہوئی سوئیٹر پہننے پر راضی ہوتے ہیں۔

میر فراست علی جب لالہ تیج رام اور شہباز خان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو لالہ تیج رام کی طبعیت نہ چاہتے ہوئے بدلنے لگتی ہے۔وہ میر صاحب کے غلط ارادے کو پہچان نہیں پاتے اور اپنے دوست شہباز خان سے بہت ناراض رہتے ہیں اور تعلق بھی توڑتے ہیں یہاں تک کہ ان سے ہولی کیلئے چندہ بھی نہیں لیتے۔مگر ان کے اندر کا نرم دل انسان اس وقت سامنے آتا ہے جب شہباز خان گھر سے قیمتی سامان توڑ کر لاتے ہیں۔ان کا دل بھر آتا ہے اور وہ ساری دشمنی بھول کر اپنے پرانے دوست سے گلے ملتے ہیں۔

سوال: ''محلے کی ہولی'' کا بنیادی پیغام کیا ہے؟

جـــواب: ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' اطہر پرویز کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ڈرامہ قومی وحدت اور بھائی چارے کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں سبھی مذاہب کے لوگ مل جل کے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔ آپس میں اخوت اور اتفاق ہے۔ لیکن ملک میں موجود کچھ ایسے عناصر ہیں جو اس بھائی چارے میں پھوٹ ڈال کر ملک کے امن وامان کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتے ہیں۔ ایسے ملک دشمن عناصر لوگوں سے خبردار رہ کر اُن کو اس برے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔

سوال: اس ڈرامہ کے نسوانی کرداروں کا دو دو جملوں میں تعارف پیش کیجئے۔

جواب: ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' کے نسوانی کرداریوں ہیں:

سوشیلا: لالہ تیج رام کی بیٹی ہے۔ وہ شہباز خان کو اپنا چاچا مانتی ہے۔ وہ نئے زمانے کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ اُسے اچھے برے کی تمیز معلوم ہے۔

خالدہ: شہباز خان کی بیٹی ہے۔ وہ لالہ تیج رام کو اپنا چاچا مانتی ہے۔ اُن کے لئے سویٹر بنتی ہے۔ وہ سوشیلا کی سہیلی ہے۔

لالہ جی کی بیوی: لالہ تیج رام کی بیوی ہے۔ لالہ جی کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے۔ لالہ جی کو غمگین دیکھ کر خود بھی غمگین ہوتی ہے۔ اُسے کھانا بنانے میں بڑی مہارت ہے۔

خالدہ کی امی: شہباز خان کی بیوی ہے۔ ملنسار اور باتمیز عورت ہے۔ مناسب تعریفیں کرتی ہیں۔

سوال: ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' کے کردار شہباز خان پر روشنی ڈالیئے۔

جـــواب: شہباز خان ڈرامہ ''محلے کی ہولی'' کے اہم کردار کا نام ہے۔ وہ لالہ تیج رام کے بڑے گہرے دوست ہوتے ہیں۔ لالہ تیج رام کے ساتھ دوستی کا رشتہ وہ ہر صورت میں نبھاتے ہیں۔ مگر جب میر فراست علی ان میں پھوٹ ڈالتا ہے تو وہ حیران ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انہیں بہت دکھ ہوتا ہے جب لالہ تیج رام ان کو چھوڑ کر سب سے ہولی کے لیے چندہ لیتے ہیں۔ وہ ضد پر اڑے رہتے ہیں کہ محلے کی ہولی کیلئے ان سے بھی چندہ لیا جائے۔ بالآخر وہ سارے لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان سے چندے کی صورت میں لکڑی ہی لے لیں اور ناراض ہو کر غصے میں چلے جاتے ہیں۔ رات کافی گزر چکی ہوتی ہے اور انہیں لکڑی کہیں نہیں ملتی ہے تو وہ جذباتی ہو کر اپنے گھر کی قیمتی کرسیاں، میز اور دروازے توڑ لاتے ہیں اور ہولی کی آگ میں جلانے کیلئے سب کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔ سب لوگ ان کے اس جذبے سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور ان کا دوست لالہ تیج رام بھی ساری شکایت بھول کر اس کے گلے ملتے ہیں۔

جانچ :

درج ذیل سوالات کے جواب مختصراً دیجئے:

ا۔ ڈرامہ میں کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے؟

۲۔ اس ڈرامہ کا کون سا کردار آپ کو اچھا لگا اور کیوں؟

۳۔ اس ڈرامہ کے نسوانی کرداروں کے نام بتائیے؛

۴۔ ڈرامہ کا پیغام کیا ہے؟

کتابیات

ا۔ ہندوستانی ڈرامہ کا ارتقاء — ابراہیم یوسف

۲۔ بیسویں صدی میں اردو ڈرامہ — یوسف سرمست

۳۔ داستان سے افسانے تک — وقار عظیم

غزل

تمہید

گیارھویں جماعت کے ہونہار طالب علمو! غزل اردو شاعری کی سب سے مقبول اور محبوب صنف ہے۔ آپ نے اردو کے کچھ مشہور شاعروں جیسے ولیؔ۔ میرؔ، دردؔ، غالب اور اقبال کی چند غزلوں کو پڑھا ہوگا اور مشاعروں میں بھی شاعروں کو غزلیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ کچھ غزلیہ اشعار آپ کے حافظے میں ضرور ہونگے۔ دراصل غزل کی مقبولیت اور محبوبیت کا عالم یہ ہے کہ اس صنفِ سخن کا رواج اب نہ صرف فارسی اور اردو زبان میں قائم ہیں بلکہ ہندوستان کی مختلف زبانوں جیسے گجراتی، پنجابی، کشمیری، مرہٹی، کنڑی اور تلگو زبان میں بھی غزلیں لکھی جارہی ہیں۔ سبھی لوگ اس کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ دراصل غزل میں زمانے کے ساتھ بدلنے، ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر طرح کے مضمون کو ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس صنفِ شاعری میں ہماری تہذیب کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری میں کئی اصناف پروان چڑھیں لیکن کوئی بھی صنف غزل کا مقابلہ نہ کرسکی۔ اسی لئے پروفسر رشید احمد صدیقی نے صنف غزل کو بجا طور پر اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔

اس اکائی میں غزل کے معنی، اس کی تعریف وتکنیک اور غزل کی تاریخ پر بحث ہوگی۔ نیز غزل میں جن صنعتوں کا استعمال ہوتا ہے اُن کا بھی خصوصی تذکرہ ہوگا۔ لہٰذا اس اکائی کے جو ہمارے پاس مقاصد ہیں اور اس اکائی کو پڑھنے کے بعد جس طرح کی آموزشی حصولیابیاں طالب علموں سے توقع کی جاتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

مقاصد:۔ (objectives)

ا۔ طالب علموں کو غزل کی تعریف، تکنیک اور تاریخ سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طالب علموں کے جمالیاتی حِس کو بیدار کرکے ان کے اندر شعری ذوق پیدا کرنا۔

۳۔ طالب علموں میں شعر فہمی پیدا کرکے معروف غزل گو شعرا سے متعارف کرانا۔

آموزشی ماحصل (learning outcome)

ا۔ طالب علم غزل کی تعریف، تکنیک اور تاریخ جانتے ہیں۔

۲۔ طالب علم اشعار کو سننا، پڑھنا اور سمجھنا جانتے ہیں۔

۳۔ طالب علم اپنے الفاظ میں غزلیہ اشعار کی تشریح کرتے ہیں۔

۴۔ طالب علم مختلف غزل گو شعرا اور ان کے کلام پر گفتگو کرتے ہیں۔

۵۔ طالب علم غزل خوانی کے فن سے واقفیت رکھتے ہیں۔

بنیادی موضوع

غزل کی تعریف اور تکنیک

عورتوں سے یا عورتوں کے بارے میں بات کرنے کو غزل کہتے ہیں۔ گویا اس کا دائرہ کار حُسن پرستی اور عشقِ مجاز ہے۔ شمس قیس رازی نے غزل کی الگ توجیہ کی ہے ہرن کو عربی میں غزال کہتے ہیں اور غزال کی ایک خاص آواز کو غزل الکلب کہا جاتا ہے۔ جب ہرن کو شکاری کتے گھیر لیتے ہیں

تو وہ سہم جاتا ہے اور اس کے حلق سے درد بھری آواز نکلتی ہے۔ شکاری کتے اس آواز سے متاثر ہو کر اس کا تعاقب چھوڑ دیتے ہیں۔ اس آواز میں مایوسی کے ساتھ امید کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اس تعریف کی رو سے غزل عشقیات سے نکل کر زندگی کی کشمکش، انسان کی کاوشوں اور امید وخوف کی حالت کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے۔

غزل کا ماخذ عربی قصیدہ ہے۔ قصیدہ میں عشقیہ تشبیب کو غزل کہا جاتا تھا۔ جس میں بالعموم محبوب کا سراپا بیان کیا جاتا اور اس کے حُسن کی تعریف کی جاتی۔ ایرانی شعرا نے اس تشبیب کو قصیدے سے الگ کر کے فارسی میں ایک الگ صنف ایجاد کی جو غزل کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر یہ صنفِ غزل فارسی سے اردو میں آئی اور یہاں اس نے ترقی کے مختلف مدارج طے کئے۔

جن چیزوں سے غزل کی صورت بنتی ہے ان میں پہلی چیز ہے بحر (شعر کا وزن کرنے یا اسے ناپنے کا پیمانہ بحر کہلاتا ہے) غزل کے تمام مصرعے کسی ایک بحر میں ہوتے ہیں۔ بحر کے بعد غزل کی دوسری پہچان ہے ردیف وقافیہ۔ ردیف وہ لفظ یا الفاظ کا ایسا مجموعہ ہے جسے غزل کے پہلے شعر یعنی مطلع کے دونوں مصروں کے آخر میں اور اس کے بعد ہر شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں دہرایا جائے۔ قافیہ وہ لفظ ہے جو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ مطلع کے دونوں مصرعوں کے آخر میں آئے لیکن ردیف ہو تو اس سے پہلے۔ مثال کیلئے آتش کا یہ شعر دیکھے۔

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

اس شعر میں کرتے، ردیف ہے اور 'روبرو' قافیہ۔ اس غزل میں روبرو کے ساتھ گفتگو، آرزو جستجو وغیرہ قوافی استعمال ہوئے ہیں۔ یہی شعر مطلع کی مثال بھی ہے۔ مطلع غزل کے پہلے شعر کو کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ استعمال کیا گیا ہو اور اگر غزل مردّف ہے تو ردیف بھی۔ غزل کے آخری شعر کو مقطع کہا جاتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ آتش کی اسی غزل کا مقطع ہے۔

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

مطلع کے فوراً بعد آنے والے ہم قافیہ یا ہمقافیہ یا ہم ردیف شعر کو حسن مطلع یا زیبِ مطلع کہتے ہیں غزل کے سب سے عمدہ بیت کو شاہ بیت کہتے ہیں جس غزل میں ردیف نہ ہو اور صرف قافیے ہوں اس کو غیر مردف کہتے ہیں وہ بحر اور ردیف اور قافیہ جس کے لحاظ سے غزل کہی جاتی ہے اسے غزل کی زمین کہتے ہیں۔

غزل کی تکنیک میں اس خصوصیت کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل معنوی اکائی ہوتا ہے۔ اور شاعر کو اشاروں اور کنایوں میں بات کرنی پڑتی ہے جس سے ابہام پیدا ہوتا ہے اور ابہام سے شعر میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے لئے غالب کا یہ شعر۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

صنعت نگاری:

غزل کے فن میں صنعت نگاری کی خاص اہمیت ہے۔ صنائع کے استعمال سے شعر میں کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ان سے شعر میں مختلف خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ غزل میں صنائع بدائع کا استعمال ہر دور میں رہا ہے۔ بعض صنعتوں سے الفاظ اور آوازوں کی تکرار ہوتی ہے اور شعر کی نغمگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس قبیل کی چند صنعتیں یہ ہیں۔

ا۔ تکرار یا تکریر: کسی لفظ کو مکرر لانا۔ مثلاً میر کا یہ شعر۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

۲۔تجنیس تام۔شعر میں ایک ذو معنی لفظ کو دو جگہ علاحدہ معنوں میں استعمال کرنا۔اس صنعت سے جہاں لفظ کی تکرار ہوتی ہے جو صوتی دلکشی بڑھاتی ہے وہیں ابہام کا حسن پیدا ہوتا ہے۔فانی کا یہ شعر ملاحظ ہو۔

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر　　جس کی تصویر ہے خیال اپنا

اس شعر میں خیال کا لفظ ایک ہی مفہوم میں دو جگہ آیا ہے جس سے اصوات کی تکرار ہوتی ہے۔لفظ تصویر بھی دو جگہ آیا ہے لیکن ہر جگہ اس کے معنی مختلف ہیں پہلے مصرع میں لفظ تصویر اصلی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔دوسرے مصرعے میں تصویر کے معنی ہیں مثال۔یہ تجنیس تام ہے۔

صنعت اشتقاق:۔شعر میں ایسے الفاظ لانا جو ایک ہی مصدر سے مشتق ہوں جیسے:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب سے

بعض صنعتوں کا تعلق صرف معنی سے ہوتا ہے جو شعر کے معنوی حسن کو بڑھاتی ہیں جیسے صنعت تضاد۔تجاہل عارفانہ اور حسن تعلیل وغیرہ

ا۔صنعت ایہام:۔شعر میں ذو معنی لفظ لایا جایے۔ذہن قریب کے معنی کی طرف جایے لیکن غور کرنے پر دوسرے اور اصلی معنی کی طرف ذہن منتقل ہو۔شعر کا مصرع ہے

ہم خاک بھی ہو گیے پر اب تک جی سے نہ تیرا غبار نکلا

صنعت مراعات النظیر:۔شعر میں ایسے الفاظ لایے جاییں جو آپس میں مناسبت رکھتے ہوں

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے　　نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہاں رخش باگ اور رکاب میں مناسبت ہے۔

تجاہل عارفانہ:۔کسی بات کو جانتے ہوے بھی لاعلمی کا اظہار کرنا۔مثلا

صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے　　کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

صنعت لف ونشر:۔شعر میں پہلے چند چیزوں کا ذکر کیا جایے پھر ان کے منسبات کو بیان کیاں جایے جیسے

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عشق زار　　گل جدا سرو جدا نرگس بیمار جدا

صنعت حسن تعلیل:۔تعلیل کے معنی ہیں علت یا وجہ بیان کرنا۔حسن تعلیل سے مراد ہے کسی چیز یا امر کی حقیقی علت سے توجہ ہٹا کر اس کی کویی اور علت بیان کی جایے۔مثلا یہ شعر

نکلا ہے لالہ خاک کے نیچے سے سرخ سرخ　　رنگین ہوا شہیدوں کے خون میں نہا نہا

صنعت مبالغہ:۔کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔مثلا یہ شعر دیکھیے۔

چمکے جو تیغ قہر کسی روز جنگ میں　　ٹھہرے نہ سایہ خوف کے مارے بدن کے پاس

صنعت تلمیح:۔کسی مشہور قصے واقعے یا کردار یا شخصیت کے ذریعے کسی بات کی طرف اشارہ کیا جایے۔تلمیح کے استعمال سے ایک یا چند لفظوں کے ذریعے سارا واقعہ یا قصا سامنے آجاتا ہے۔شعر میں کفایت لفظی اور ایمائیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔مثلا

عاشق اس غیرت بلقیس کا ہوں میں آتش　　بام تک جس کے کبھی مرغ سلیمان نہ گیا

غرض ضایع لفظی اور ضایع معنوی نہ صرف شعر کی لفظی اور معنوی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ ان سے شعر میں ایمائیت کا وصف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

غزل کے موضوعات:۔

غزل کا خاص موضوع عشق ہے۔غزل کا واحد متکلم عاشق ہوتا ہے۔غزل میں وہ اپنے عشقیہ جزبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔حسرت کا شعر ہے۔

حسن بے پروا کو خود بیں وخود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

عشق مجازی کے بعد غزل کا خاص موضوع عشق حقیقی اور تصوف ہے۔

ارض وسماں کہاں تیری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سماں سکے

عشق مجازی اور عشق حقیقی یا تصوف کے علاوہ اردو غزلیہ شاعری کے دیگر موضوعات کا شمار نہیں۔حیات وکائینات کے گونا گوں مسایل پر غزل گو شاعروں نے غور وخوض کیا،زندگی کو برتا،قریب سے دیکھا اور محسوس کیا۔غرض غزلیہ شاعری نے انسانی زندگی کے سارے معملات کا احاطہ کیا۔

غزل کا آغاز وارتقاء:۔

غزل گوئی کا آغاز پہلے فارسی میں نویں صدی عیسوی میں ہوا۔دسویں صدی کے نصفِ اول میں رودکیؔ نے اس صنف کو فروغ دیا اور غزل کا دیوان مرتب کیا۔رودکیؔ کے بعد غزل مسلسل ترقی کرتی گئی اور اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوگئی۔اردو میں غزل فارسی سے آئی اور یہاں بہت سارے شعرا نے اس صنف کو بخوبی اپنایا اور اس کے موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔

اردو میں غزل گوئی کی ابتدا امیر خسرو سے ہوئی لیکن دکنی شاعروں نے اس صنف کو پہلے پروان چڑھایا۔دکنی شعرا نے غزل کا سانچا فارسی شاعری سے لیا لیکن فارسی کی پیروی بہت کم کی۔دکن کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قلی قطب شاہ غزل گو بھی تھا لیکن اس صنف میں جن دکنی شعرا نے خاص طور پر نام پیدا کیا ہے ان میں سراج اور ولی قابل ذکر ہیں شمالی ہند کے فارسی شعرا ولیؔ کا کلام دیکھ کر ہی اس طرف متوجہ ہوئے۔ان میں شاہ حاتمؔ،شاہ مبارک آبرو،مرزا جانِ جاناں کے نام اہم ہیں۔اس کے بعد غزل کے سنہری دور کا آغاز ہوتا ہے۔اس دور کے لافانی شاعر ہیں۔میر،سوداؔ اور دردؔ۔اس کے بعد دہلی کے اجڑنے پر لکھنو میں شاعری کی محفل جمتی ہے۔یہاں کے شاعروں میں مصحفیؔ،انشا،اور جرتؔ قابلِ ذکر ہیں۔ان کی غزلوں کا انداز شعرائے دہلی کی غزلوں سے مختلف ہے۔اس کے بعد دہلی میں شعروشاعری کی محفلیں پھر سے آراستہ ہوئی ہیں۔غالب ذوق اور مومن اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔غالب نے غزل کے موضوعات کو وسعت دی اسے فکر سے آشنا کیا۔ذوق نے زبان پر زیادہ زور دیا۔مومن نے معاملات عشق میں نام حاصل کیا۔اقبال نے غزل میں فلسفہ پیش کر کے ایک نئے انداز کی بنیاد رکھی۔ان کے بعد اصغر،فانی،شاد،حسرت،آرزو،یگانہ اور جگر نے غزل کو فروغ دیا۔پھر فراق،فیض،روش،جذبی،خورشید الاسلام،ناصر کاظمی،خلیل الرحمان اعظمی،شاذ تمکنت، شہریار،بشیر بدر،ظفر اقبال،احمد مشتاق،وغیرہ نے غزل کی آبیاری کی اور اس فن کو آگے بڑھایا۔

﴿ولی دکنی﴾

حالات زندگی:۔

ولی اللہ ولی ۱۶۶۸ء میں اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔حصول علم کے لئے احمد آباد گئے۔جو اس زمانے علم وفن کا مرکز تھا۔وہاں شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ کے مدرسے میں داخل ہوگئے۔ولی کی عمر کا بیشتر حصہ احمد آباد میں گزرا۔اس شہر کت فراق میں انہوں نے ایک پُر درد قطعہ بھی لکھا۔ولی نے گجرات سورت اور دہلی کا سفر بھی کیا۔اس سے متعلق اشارے ان کے کلام میں موجود ہے۔

دہلی میں ولی کی سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی۔تو وہ ان کا کلام دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور مشورہ دیا کہ اُن تمام مضامین کو جو فارسی میں بیکار

پڑے ہیں ریختہ کی زبان میں کام میں لانا چاہیے۔دوسرا مشورہ یہ دیا کہ دکنی الفاظ کا استعمال کم کرواوران کی جگہ فارسی کے شیرین الفاظ کا انتخاب کرو۔

قائم جانب پوری نے اپنی تزکرے نکاتِ سُخن میں لکھا ہے کہ ولی نے سعد کے مشورے پرعمل کیا اور دوسری مرتبہ دہلی کئے تو ان کے کلام کی خوب قدر ہوئی اور یہاں تک شہرت ہوئی کہ امراء کی محفلوں اور مجلسوں اور کوچہ و بازار میں ولی کے اشعار لوگوں کی زبان پر تھے۔ولی دکنی کو محمد حسین آزاد نے اردو شاعری میں وہی مقام دیا ہے جو انگریزی شاعری میں چاسر اور فارسی شاعری میں رودکی کو حاصل ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق ولی ۱۷۳۰ء کے بعد فوت ہوگئے۔تاہم زیادہ تر محققین کا خیال ہے کہ ولی دکنی ۱۷۰۸ء کے لگ بھگ فوت ہوئے تھے۔

ولی کی غزل گوئی۔

ولی نے متعدد شاعری اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غزل کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس کے دامن کو وسیع کیا۔ولی نے اپنی زبان اور اس کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے شاعری کے لئے عربی اور فارسی بحروں کا انتخاب کیا۔فارسی کی جو ترکیبیں یہاں کھپ سکتی تھیں ان کا استعمال کیا اور نئی ترکیبیں وضع کیں۔ولی کی زبان سادہ اور سہل ہے۔لیکن اس سادگی میں بھی حسن ہے۔انہیں پیکر تراشی میں بڑی مہارت حاصل ہے۔خوبصورت تشبیہیں اور استعارے استعمال کرنے کا انھیں خوب سلیقہ ہے۔اکثر صنائع بدائع سے بھی کام لیتے ہیں
خوش آہنگی نے بھی کلام ولی کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ملاحظہ ہو ان کے چند اشعار۔

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ و آہستہ کہ آتش گل کو کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولی مجھ دل آتا ہے خیال یار بے پروا کہ جیوں انکھیاں سنیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

فلسفہ کی گہرائیاں، علمی مضامین اور اخلاقی باتیں نہ ہونے کے باوجود ولی کی شاعرانہ اہمیت مسلمہ ہے۔جب بھی اردو غزل کی بات ہوگی اولیت کا تاج ولی کے سر کی زینت بنے گا۔ولؔی اردو غزل کا بابا آدم نہ سہی، غزل کو نئے راستوں پر ڈالنے کا معمار ضرور ہے۔

خواجہ میر درد

خواجہ میر درد ۱۷۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔مشہور صوفی اور شاعر خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے تھے۔ایک ذی علم اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ان کے بزرگ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بخارا سے ہندوستان آئے۔اس خاندان کے افراد کو ہر زمانے میں بڑا احترام حاصل رہا۔

گھر کا ماحول علمی تھا اس لئے خواجہ میر درد کمسنی ہی سے علم و ادب کی طرف متوجہ ہوگئے۔اردو عربی، فارسی تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔قرآن حدیث، فقہ، تفسیر، اور تصوف کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔پندرہ برس کی عمر میں فارسی کا ایک رسالہ تصنیف کر چکے تھے۔فارسی اور اردو میں شعر بھی اسی عمر سے کہنے لگے تھے۔فنِ موسقی میں ایسی مہارت بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے فنکار ان کی داد کو اپنے کمال کی سند جانتے تھے۔جب دہلی اجڑی اور خان آرزو دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔تو یہ محفل سرد کے مکان پر ہونے لگی۔اروجب انہوں نے درویشی اختیار کر لی تو یہ ذمہداری میر تقی میر نے قبول کر لی۔آخر میر درد ۱۷۸۸ء میں وفات پائی اور دہلی ہی میں ان کا مدفن قرار پایا۔

غزل گوئی۔

دردؔ صوفی شاعر ہیں لیکن ان کے دیوان میں حقیقت کے ساتھ ساتھ مجاز کے شعر بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ مثلاً

کون سی رات آن ملے گی　　　دن بہت انتظار میں گزرے

خواجہ میر درد فلسفہ وحدت الوجود کا قائل نظر آتے ہیں ان کے کلام میں اس مضمون کے اشعار بہت نظر آتے ہیں۔

جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا　　　تو ہی تو آیا نظر جدھر دیکھا۔

دردؔ کو موسیقی سے گہرا لگاو تھا اس لئے ان کی غزلیں مترنم ہوتی ہیں عام طور پر وہ چھوٹی بحروں کا انتخاب کرتے ہیں اور الفاظ کو ایسے سلیقے سے ترتیب دیتے ہیں کہ شعر میں صوتی حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا　　　بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی　　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

کلام دردؔ میں جدلیاتی عناصر کی فراوانی ہے۔ دردؔ تشبیہ و استعارے کا استعمال ایسی ہنرمندی کے ساتھ کرتے ہیں کہ ایک جیسی جاگتی تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے۔ چند مثالیں پیش کریں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شمع کی مانند اس بزم میں　　　چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال

حیات زندگی:۔

اقبال بیسویں صدی کے ایک معروف شاعر، مصنف، قانون دان، سیاست دان اور صوفی تھے۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء میں ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا اور ماں کا نام امام بی بی تھا۔ اگر چہ یہ دونوں بہت تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکس انہوں نے اپنے بیٹے کی تربیت پر بہت توجہ کی۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ آٹھ برس کی عمر میں اقبال اسکاچ مشن اسکول میں داخل کر دیے گیے۔ اس سے پہلے شیخ نور دین محمد کے دوست سید محمد حسن سے اردو، فارسی اور عربی ادب کی کچھ تعلیم حاصل کی تھی اور سید کی صحبت میں ہی اقبال کے اندر شعری ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اقبال نے ۱۸۹۱ء میں اور ۱۸۹۳ء میں امتیازی پوزیشن کے ساتھ میٹرک پاس کیا۔ بی۔ اے کی ڈگری کیلئے اقبال نے گورمنٹ کا؛ ج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم۔ اے کیا ایم، اے کی تعلیم کے دوران اقبال کو فلسفے کے پروفسر سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ ۱۹۰۵ء میں انھیں اعلی تعلیم کے لیے انگلستان جانا پڑا اور ۱۹۰۸ئمیں وہ وہاں سے وطن واپس ائے۔

اقبال نے اورینٹل کالج اور گورمنٹ کالج لاہور میں ملازمت کی۔ اس کے بعد وکالت بھی کی۔ حکومت برتانیہ نے انھیں ۱۹۲۳ء میں سر کا خطاب دیا۔ آخر ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

غزل گوئی:۔

بانگ درا اقبال کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔اس میں دونوں طرح کی غزلیں شامل ہیں۔وہ بھی جوانہوں نے روایتی انداز میں کہیے اور وہ بھی جوان کی شاعری کی نئی سمت کا پتا دیتی ہیں۔ان کی غزل کا انداز یہ تھا۔

زمانا آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا　　　سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا۔

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی　　　جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

بال جبریل اقبال کے اردو کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔اس میں جو غزلیں شامل ہیں انہیں اقبال کے فرفن کی معراج کہنا چاہئے۔غزل اقبال کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا فکری عنصر ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں بھی جا بجا خودی کا فلسفہ پیش کیا۔

گراں بہاں ہیں تو حفظ خودی سے ہے ورنہ　　　گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال نے تمام شاعری وسائل کا سہارا لیا اور سامعین و قارعین کو اپنی گرفت میں لے لیا ان کی غزلیں اور نظمیں خوبصورت تصویروں کی آرٹ گیلری ہے۔استعارات وتشبیہات کے استعمال کا سلیقہ خوب رکھتے ہیں ان کے کلام میں ترنم بہت زیادہ ہے۔موسقی سے ان کی طبیعت کو بہت مناسبت ہے۔غرض اقبقل نے بیسویں صدی میں غزل کو نئے اسلوب نئی لفظیات اور نئے موضوعات سے روشناس کیا اور اپنے فلسفیانہ افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

شادؔ عظیم آبادی

حالاتِ زندگی: سید علی محمد نام، شادؔ تخلص، 1846ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ان کے والد الہ آباد سے ترکِ سکونت کر کے عظیم آباد میں آبسے تھے۔علی محمد کی تعلیم کا آغاز بہت کم عمری سے ہوا۔رواج کے مطابق یہ کام مولویوں کو سونپا گیا لیکن ان کی اصل تربیت میر سید محمد نے کی۔شعر کہنے لگے تو مختلف استادوں سے اصلاح لی لیکن آخر کار شاہ الفت فریادؔ کی شاگردی اختیار کی۔ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے 1891ء میں انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔بتیس برس تک شادؔ اعلیٰ اختیارات کے ساتھ آنریری مجسٹریٹ رہے اور چودہ برس تک گورنمنٹ کے نامزد کردہ میونسپل کمشنر۔سرکار سے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا رہا اور آخر کار 1927ء میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

ادبی کارنامے: نثر و نظم میں شادنے کئی تصانیف بطور یادگار چھوڑیں جو قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ان کی چند کتابیں ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئی تھیں۔شادؔ کی غزلوں کا دیوان ان کی وفات کے بعد 1938ء میں اُن کے شاگرد حمید عظیم آبادی نے مرتب کر کے ’’نغمۂ الہام‘‘ کے نام سے شائع کیا۔بعد میں ان کی خودنوشت ’’شاد کی کہانی شاد کی زبانی‘‘ شائع ہوئی۔اس کے علاوہ، حیاتِ فریاد، رباعیاتِ شادؔ، سروشِ مستی، میخانۂ الہام، مادرِ وطن اور متعدد مجموعے بھی منظرِ عام پر آئے۔

خصوصیاتِ کلام: شادؔ نے مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور دوسری اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، لیکن ان کی شہرت کا باعث اُن کی غزلیں ہیں، جو سادگی اور نرمی، ترنم و شیرینی، کیف و سرور اور تازگی و تاثیر کی بدولت لائق توجہ ہیں۔شادؔ کے زمانے میں غزل کا زور اور اثر کم ہونے لگا تھا۔شادؔ نے اسے نکھارنے، سنوارنے اور استحکام بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔زبان کی صفائی و سادگی شادؔ کی شاعری کا خاص وصف ہے۔وارداتِ قلبی کے ساتھ ساتھ اخلاق، فلسفہ اور توحید ان کے محبوب موضوعات ہیں۔شادؔ ان سب کو اپنے لطیف اندازِ بیان سے پسندیدہ اور پُر تاثیر بنا دیتے ہیں۔

جگرؔ مراد آبادی

حالاتِ زندگی: جگرمرادآبادی کا اصل نام علی سکندر تھا اور مراد آباد اتر پردیش میں 1885ء میں پیدا ہوئے۔انہوں نے فارسی کی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی اور پھر باضابطہ تعلیم ایف اے تک جوبلی اسکول اور مشن اسکول لکھنو سے حاصل کی۔گھر والوں کے ساتھ اَن بن ہونے پر انہوں نے مراد آباد چھوڑ کر گونڈہ کی راہ لی اور وہاں اصغر گونڈوی کے ساتھ قیام کیا اور وہیں اپنی باقی عمر گزار کر 1960ء میں انتقال کیا۔

خصوصیاتِ کلام: جگر کو فارسی زبان پر کافی قدرت حاصل تھی اور اس زبان میں کافی عمدہ شاعری بھی کی ہے مگر ان کی مقبولیت اردو زبان کی وجہ سے ہوئی۔جگر شاعری کا شوق بچپن سے ہی رکھتے تھے۔پہلے اپنے والد سید علی نظر، پھر داغ دہلوی اور پھر تسلیم کے شاگرد ہوگئے۔ان کے کلام میں دلکشی، دلنشینی، رنگینی اور ایک خاص انداز پایا جاتا ہے۔جگر نے غزل کی صنف میں ایک نئی روح پھونکی اور اس کو غزل دشمنی کے زمانے میں بھی زندہ رکھا۔ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں ''داغِ جگر''، ''آتشِ گل'' اور ''شعلۂ طور'' کافی مشہور ہیں۔

حکیم منظورؔ

حالاتِ زندگی: نام محمد منظور، حکیم اسم نسبتی ہے اور قلمی نام حکیم منظور۔25 ؍دسمبر 1938ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول راجوری کدل سرینگر میں پائی۔بعد میں ایس۔پی کالج سرینگر میں داخلہ لیا۔یہاں پروفیسر عبدالاحد رفیق، مولوی نورالدین، پروفیسر غیاث الدین اور پروفیسر جیا لال کول جیسے اساتذہ سے اثر قبول کیا۔ایف۔ایس۔سی کرنے کے بعد سائنس چھوڑ کر آرٹس مضمون کو اپنایا۔علی گڑھ سے ادیب کامل کا امتحان پاس کیا۔حکیم منظور کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔وہ ایک ذہین اور قابل افسر تھے۔کسٹوڈین جنرل بنے، ڈپٹی کمشنر بارہمولہ رہے، ناظم تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے۔سرکاری ملازمت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد پوری طرح ادب کی خدمت میں جُٹ گئے۔آخر کار انہوں نے 21 ؍جنوری 2007ء میں انتقال کیا۔

خصوصیاتِ کلام: حکیم منظورؔ نظم، غزل، دوہے، تربینی، ماہیے، پٹّے، ہائیکو جیسے اصناف سخن میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔حکیم منظور کی شاعری میں جذبہ اور احساس کی ایک زیریں رو اور ایک فعال ذہانت ہے۔استعارہ سازی میں وہ یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔حکیم منظور کے یہاں شاعری کا آغاز انبساط اور خوشی سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام بصیرت پر ہوجاتا ہے۔اُن کی فکر کا سرچشمہ اُن کی دھرتی کی اعلیٰ تمدنی، تہذیبی اور علمی روایات ہیں۔انہوں نے کشمیر اور کشمیریت کے نقوش کمالِ سادگی سے علامتوں کے طور پر استعمال کئے اور انہیں مقامی سے آفاقی بنادیا۔

ادبی کارنامے: حکیم منظور نے شعر گوئی کی باقاعدہ شروعات 1964ء کے آس پاس کی۔پہلے افسانے لکھتے تھے۔لیکن بعد میں تمام تر ذہنی قوت شعر گوئی میں لگادی۔اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''ناتمام'' 1978ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد ''لہولمس چنار''، ''برف رتوں کی آگ''، ''خوشبو کا نیا نام''، ''پھول شفق آنگن کے''، ''شعر آسمان'' اور ''صبح شفق تلاوت'' شائع ہوئے۔حکیم منظور نے تنقیدی اور تاریخی مضامین بھی لکھے ہیں۔کشمیر یونیورسٹی نے اُن کی تصنیف ''اقبال ایک تذکرہ'' شائع کی ہے۔ایک عرصے تک اخبار ''خبرونظر'' کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔حکیم منظور کو ان کی ادبی خدمات کے صلے میں جموں وکشمیر کی کلچرل اکیڈیمی، اتر پردیش، مغربی بنگال اور بہار اُردو اکادمیوں سے انعامات بھی حاصل ہوئے۔

جانچ :

۱۔ غزل کے لغوی معنی کیا ہیں؟

۲۔ قافیے اور ردیف کی وضاحت کیجئے۔

۳۔ غزل کی زمین سے کیا مراد ہے؟

۴۔ تکرار اور تجنیس تام سے کیا مراد ہے؟

۵۔ صنعتِ حسن تعلیل کسے کہتے ہیں؟

۶۔ اردو غزل گوئی کی ابتدا کس سے ہوئی ؟

۷۔ دکن کے دو مشہور شعرا کے نام لکھیے۔

۸۔ غالبؔ نے غزل کو کس سے آشنا کیا؟

۹۔ اقبال نے غزل میں کیا پیش کیا؟

۱۰۔ ولی دکنی کی تاریخ پیدائش اور مقامِ وفات بتایئے؟

۱۱۔ میر دردؔ کی تاریخ وفات اور مقام وفات بتایئے؟

۱۲۔ علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لئے کب انگلستان گئے؟

۱۳۔ شاد کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

۱۴۔ جگر کب اور کہاں وفات پائے۔؟

۱۵۔ حکیم منظور کی تاریخ پیدائش بتایئے؟

نظم نگاری

تمہید :۔

ہم اس امید کے ساتھ آپ طلبا و طالبات سے مخاطب ہیں کہ آپ غالبًا بچپن سے ہی اردو نظموں سے مانوس ہیں۔ابتدائی جماعتوں سے لیکر ثانوی جماعتوں تک آپ نے مشہور نظم گو شعرا کی خوبصورت نظموں کو سنا اور پڑھا ہوگا اور کبھی کبھی اسکولوں میں اسٹیج پر بھی چند دلکش نظموں کو ترنم کے ساتھ پڑھکر دوسروں کے لیے لطف وسرور کا سامان مہیا کیا ہوگا۔نظیر، آزاد، حالی، اسماعیل میرٹھی، چکبست اور اقبال وغیرہ جیسے معروف نظم گو شاعروں سے آپ پہلے ہی آشنا ہیں۔ یہ بھی آپ جانتے ہونگے کہ ان شعرا نے خدا کی وحدانیت، مظاہر فطرت، انسانیت، وطن کی محبت اور دیگر بہت سارے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ غزل کے مقابلے نظمیں ایک عنوان کے تحت لکھی جاتی ہیں۔غزل اگر اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے تو نظم اردو شاعری کی وسیع ترین صنف ہے کیونکہ اس صنف میں بہت زیادہ تجربے کیے گیے ہیں ۔ بے شمار عنوانات پر نظمیں لکھی جا چکی ہیں اور یہی اس کی وسعت کی دلیل ہے۔گیارھویں اور بارھویں جماعت کے اردو نصاب میں بھی اردو کے کچھ ممتاز نظم گو شعرا کی بڑی معنی خیز نظمیں شامل ہیں جن کا گہرا

مطالعہ آپ طالب علموں کیلئے ضروری ہے تا کہ اس سے ایک تو آپ کے جمالیاتی ذوق کو فروغ ملے اور دوسرا آپ کے اندر نئے خیالات، نیک جزبات اور حسین احساسات پیدا ہو سکیں۔

مقاصد :۔ اس اکائی کے ذریعے

۱۔ طالب علموں کو نظم کی صنفی شناخت، اور نظم کی تاریخ سے آشنا کرنا

۲۔ طالب علم کے جمالیاتی حس کو بیدار کر کے ان کے اندر شعری ذوق پیدا کرنا

۳۔ طالب علموں کو معروف نظم گو شعرا سے متعارف کر کے ان کو نظمیہ شاعری کی اہمیت وافادیت بتانا۔

آموزشی حصولیا بیان :۔

۱۔ طالب علم نظم کی صنفی شناخت اور تاریخ جانتے ہیں۔

۲۔ طالب علم نظمیہ اشعار کو سننا، پڑھنا اور سمجھنا جانتے ہیں

۳۔ طالب علم اپنی استعداد کے مطابق نظموں کا خلاصہ اپنے الفاظ میں کرتے ہیں

۴۔ طالب علم مختلف نظم گو شعرا اور ان کے کلام پر گفتگو کرتے ہیں۔

۵۔ طالب علم نظم خوانی کے فن سے واقفیت رکھتے ہیں۔

نظم کی صنفی شناخت

نظم کا لفظ عام طور سے نثر کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور جملہ اصناف شعری کو بھی نظم ہی کہتے ہیں۔اس اعتبار سے قصیدہ' مثنوی 'غزل' رباعی اور دیگر اصناف شعری نظم کے تحت آتے ہیں لیکن یہاں نظم سے ہماری مراد وہ مخصوص صنف ہے جسے ہم عام طور پر غزل کے مقابل رکھتے ہیں۔غزل کی ایک مخصوص ہیت ہے اور نظم کی نہیں۔

نظم کے لغوی معنی 'موتی پرونے' کے ہیں یعنی ایک لڑی میں موتیوں کو پرونا۔خیال وفکر کی شہرازہ بندی تسلسل اور ربط یہی نظم کی پہچان ہے۔غزل کے برخلاف نظم کی ہیت مخصوص نہیں ہوتی لیکن اس کے اشعار میں خیال یعنی مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے کیونکہ نظم کسی ایک موضوع پر کہی جاتی ہے۔

جس طرح نظم کے موضوعات لامحدود ہیں اسی طرح اس کے شکلوں کی تعداد بھی بہت ہے۔مستمط کی ساری شکلیں یعنی مثلث' مربع' مخمس' مسدس' مسبع، مثمن، متسع، معشر سب اس میں شامل ہیں بلکہ بعض جگہ غزل اور مثنوی کا فارم بھی اختیار کیا گیا۔ترکیب بند اور ترجیع بند بھی اس میں شامل ہیں نظم معری اور آزاد نظم معری اثر سے اردو میں رواج پانے والی پیش ہیں گیت بھی نظم کی ایک شکل ہے۔

آیے اب نمونے کے ظور پر یہ دیکھیں کہ نظم نے کون سی شکلیں اختیار کی ہیں

غزل: غزل کا فارم نظم سے قطعی مختلف ہے لیکن نظم نے اس کا اکثر خیال کیا ہے۔مثال کے طور پر اقبال کا ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندستان ہمار'' ا ایک نظم ہے لیکن شاعر نے غزل کا فارم اختیار کیا ہے۔

مثنوی:۔اقبال کی نظم 'والدہ محروم کی یاد میں' مثنوی کی شکل میں لکھی گیی۔

ترکیب بند: اس میں غزل کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔نظم کا ہر بند غزل کی شکل میں ہوتا ہے لیکن ہر بند کا آخری شعر دوسرے قافیے میں ہوتا ہے۔

ترجیع بند: یہ ترکیب بند کی طرح ہی ہوتا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ ترکیب بند میں ٹیپ کا شعر ہر بند میں الگ ہوتا ہے جبکہ ترجیع بند میں ٹیپ کا ایک ہی شعر ہر

بند کے آخری میں دہرایا جاتا ہے۔

مستزاد: مستزاد وہ شکل ہے جس میں ہر مصرعے کے بعد ایک چھوٹا سا ٹکڑا بڑھا دیا جاتا ہے۔

قطعہ: قطعے میں غزل کی شکل اختیار کی جاتی ہے لیکن غزل کے برخلاف اس کے معنی ہیں تسلسل پایا جاتا ہیں۔

مسمط: یہ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں پرونا۔ اس طرح یہ بھی ایک نظم ہوہی۔ اس کے مختلف قسمیں ہیں جو بند کے اشعار کی تعداد کو نظر میں رکھتے ہوے مقرر کی گئی ہیں۔ وہ قسمیں یہ ہیں۔

مثلث ۔ مربع ۔ مخمس ۔ مسدس ۔ مسبع ۔ مثمن ۔ متسع ۔ معشر

اردو نظم کا آغاز و آرتقاء

ایک علیحدہ صنف سخن کی حیثیت سے نظم ہمیں سب سے پہلے نظیر اکبر آبادیؔ کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ نظیرؔ کی بعض نظمیں اس کی بہترین مثالیں ہے۔ مولانا محمد حسین آزادؔ اور حالیؔ نے نظم کو پائیدار بنیاد اور استحقاق بخشا۔ زندگی کا ہر واقعہ، ہر واردات و تجربہ، ہر رنگ اس کا موضوع ہے۔

جدید اردو شاعری کا آغاز ۱۸۶۵ء میں لاہور میں انجمن پنجاب کے قیام سے ہوتا ہے۔ اور جدید اردو نظم کا بھی مشاعروں میں طرحی مصرعوں کی بجائے موضوع اور مختلف موضوعات پر نظمیں تخلیق کرنے کا امتیاز بھی اسی انجمن کو ہے۔ اردو شاعری کی بعض بہترین نظمیں انہیں مشاعروں کی دین ہیں۔

مولانا حالیؔ، آزاد، چکبستؔ، اقبالؔ اور ظفر علی خان نے اپنی نظموں میں زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو اپنایا۔ ان شعرا نے نظم سے بہت کام لیے بقول پرفیسر احتشام حسین:

''بہت سے سوئے ہوئے احساس جاگے، دبے ہوئے جذبے ابھرے۔ دھندلے خیالات روشن ہوئے۔ محدود خیالات کی حدیں وسیع ہوئیں۔ موضوعات کے انتخاب کا نظریہ بدلا۔ اور قدیم اور جدید کی آمیزش سے تنوع پیدا ہوا۔''

اس دور کی نظموں میں علامہ اقبال کی نظمیں اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اقبال نے صحیح معنوں میں اردو نظم کو ایک بالکل ہی نئے انقلاب سے روشناس کیا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں ان دشوار سوالات کو حل کرنی کی کوشش کی ہے جن کا تعلق تاریخ، عمرانیات، سیاسیات اور روحانیت وغیرہ سے ہے۔

علامہ اقبال کے بعد جوشؔ کا نام بھی بہت اہم ہے۔ جوشؔ کی نظم نگاری میں اگر چہ فکر و فلسفے کا پہلو کمزور ہے لیکن رعنائی خیال اور شدت جذبات میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

جوشؔ کی نظموں میں فطرت نگاری کا رجحان پایا جاتا ہے۔ انہوں نے انقلاب کا نعرہ لگایا تو دوسری طرف صبح و شام، برسات، چاندنی رات کی کامیاب تصویر کشی کی۔ فکر کی گہرایِ ان کے یہاں بیشک کم ہے لیکن اندازی بیان دلکش اور بلند آہنگ ہے۔

اختر الایمان کی شاعری میں ایک پورے عہد کا درد و قرب کھینچ آیا ہے۔ ان کی آواز اپنے تمام ہم عصروں سے الگ ہے اور صاف پہچانی جاتی ہے۔

شہریار، ندا فاضلی، راشد آزر، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، وحید اختر، محمد علوی، زاہدہ زیدی، شہنشاہ مرزا، شکیب نیازی، نعیم اشفاق، حمید سہروردی وغیرہ اردو کے دیگر اہم نظم گو شعرا ہیں۔

نظم گو شعرا اور ان کی نظمیں

نظیر اکبر آبادی

حالاتِ زندگی:

نظیر اکبر آبادی 1740ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کا اصلی نام ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔نظیر اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔آپ کے والد کا نام محمد فاروق تھا۔احمد شاہ ابدالی کے وقت آپ دہلی چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے آگرہ آ گئے۔نظیر عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے۔آپ کے مزاج میں حد سے زیادہ قلندری تھی۔آپ میلوں ٹھیلوں اور رنگ رلیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔آپ نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔

شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے ہی تھا۔آپ نے غزلیں بھی کہیں ہیں لیکن آسان، سلیس اور مترنم نظمیں ہی آپ کی شہرت کا سبب بنیں۔آپ کی نظموں میں آدمی نامہ، مکافاتِ عمل، روٹی نامہ وغیرہ مشہور ہیں۔آپ نے اپنی نظموں میں عوام کی زبان استعمال کی ہے اور عوامی موضوعات پر اظہارِ خیال کر کے عوامی شاعر ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔تقریباً 96 سال کی عمر میں آپ نے 1830ء میں وفات پائی۔

خصوصیاتِ کلام:

اُردو میں نظم گوئی کی تاریخ میں نظیر کو بڑی سبقت حاصل ہے۔نظیر اکبر آبادی ایک قادر الکلام اور نہایت پُر گو شاعر تھے۔اُن کے کلام میں عوامی زندگی کی ترجمانی نظر آتی ہے۔انہوں نے یہاں کے ہندو مسلم تہواروں کے بارے میں بھی بڑی دلچسپ نظمیں کہی ہیں اور اپنے دور کے میلوں ٹھیلوں اور عوامی مشغلوں کی عکاسی بھی ان کے ہاں نظر آتی ہے۔نظیر کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی اور وہ ہر موضوع پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کہتے تھے۔ان کے ہاں دیوالی، ہولی، بسنت جیسے مقبول عام ہندوستانی تہواروں کا ذکر ملتا ہے۔

نظیر کے کلام سے ہم ان کے عہد کی تہذیب اور طرزِ زندگی سے بھی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ان کے ہاں الفاظ کی بڑی کثرت ملتی ہے اور ہر قسم کے موضوع پر اظہار خیال کرنے پر اُنہیں قدرت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ نظیر کو اُردو شاعری کا بہت ہی بڑا اہم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

چند بندوں کی تشریح۔بنجارا نامہ

حوالہ: درج ذیل بند ہماری نصابی کتاب میں درج نظم ''بنجارا نامہ'' سے منتخب کیا گیا ہے جو نظیر اکبر آبادی کی لکھی ہوئی ایک نمائندہ نظم ہے۔اس میں شاعر نے دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کو بڑی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔الفاظ کا خوبصورت اور مناسب استعمال اس نظم کی خصوصیات میں شامل ہے۔

بند نمبر۱: نظیر فرماتے ہیں کہ اے شخص لالچ مت کر اور تو کیوں شہر در شہر مارا مارا پھرتا ہے۔تو دیکھ رہا ہے کہ موت کا ڈاکو دن رات ڈھول بجا بجا کر ہزاروں کو لوٹ رہا ہے۔یہ تیرے بیل، بھینس اور دنیا کی بڑی بڑی چیزیں جن کا تو لالچ کر رہا ہے، سب دُنیا میں پڑی رہ جائیں گی جب تیری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

بند نمبر۲: اس بند میں شاعر فرماتے ہیں کہ اے سوداگر! تجھ سے بھی بڑا ایک بیوپاری اور بھی ہے۔یہ تیری سب چیزیں، نمک، گُڑ، مصری، زعفران وغیرہ جن کا تو لالچ کر رہا ہے۔جب تو مر جائے یہ سب کچھ تیرے کام نہ آئے گا۔سب اِسی دُنیا میں پڑا رہ جائے گا۔

بند نمبر۳: شاعر فرماتے ہیں کہ اے شخص! تو بدھیا اور بیل پر سامان لاد کر مشرق اور مغرب لے جاتا ہے۔یا تو تجھے فائدہ ہو گا یا نقصان۔لیکن موت کے ڈاکو نے راستہ میں تجھے مار ڈالا۔تو روپیہ، پیسہ، دوست، رشتہ دار، خاندان کے افراد کوئی کچھ کام نہ آئیں گے۔جب تو مر جائے گا تو یہ ساری چیزیں یہاں پڑی رہ جائیں گی۔تو اُن کو ساتھ نہیں لے جاسکے گا۔

اکبرالہ آبادی

حالاتِ زندگی: اُردو کے طنز نگار شاعروں میں اکبرالہ آبادی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اُن کا پورا نام سید اکبر حسین رضوی تھا ۱۶/نومبر ۱۸۲۶ء کو ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد تفضّل حسین سے حاصل کی۔قیام الہ آباد کے بعد پہلے مکتب اور پھر جمنا مشن اسکول میں داخل ہوئے۔ملازمت کی ابتدا ارض نویسی سے کی اور ترقی کرکے ۱۸۹۴ء میں جج کے عہدے تک پہنچ گئے۔حکومت کی طرف سے خان بہادر کا خطاب ملا۔پہلے روایتی قسم کی شاعری کرتے تھے بعد میں شاعری میں طنز و مزاح کو اپنایا۔مزاج میں شوخی، ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔اکبر کا آخری زمانہ ذہنی وجسمانی تکالیف اور پریشانیوں میں گذرا۔اپنی اہلیہ اور چھوٹے بیٹے کی موت اور نامساعد حالات سے وہ دل برداشتہ ہوگئے تھے۔بالآخر ستمبر ۱۹۲۱ء میں پچھتر برس کی عمر میں ابدی نیند سو گئے۔

خصوصیاتِ کلام: جس ماحول میں اکبر نے آنکھ کھولی وہ تیزی کے ساتھ بدل رہا تھا۔ایک طرف پرانی تہذیب کا رنگ تھا اور دوسری طرف انگریزی تعلیم کی وجہ سے ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی۔اکبر ایک مذہبی آدمی تھے اور وقت کے انقلاب اور تبدیلیاں دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر غم وغصہ کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔اگرچہ وہ وقت کی رفتار کو نہ روک سکے لیکن انہوں نے قومی زندگی کی بہت سی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا۔

اکبر نے مخصوص ظریفانہ انداز سے اصلاحی کام کیا۔اُن کے جذبات پاکیزہ اور لطیف ہیں۔سادگی اور روانی ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیات ہیں۔ان کا طرزِ بیان اس قدر دلکش ہے کہ نصیحت کی تلخی کا احساس تک نہیں ہوتا یعنی وہ پھولوں کے تیر چلاتے ہیں جن کی چوٹ جسم پر نہیں بلکہ روح پر لگتی ہے۔اکبر کا کلام ''کلیاتِ اکبر'' کے نام سے تین حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔

نظم ''فرضی لطیفہ'' کا ''مرکزی خیال''

اکبرالہ آبادی نے اپنی دلکش نظم میں موجودہ زمانے کی حالت زار، غفلت اندیشی اور نالائقی پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اب اس قوم کو تباہی اور بُربادی سے بچانے والا کوئی نہیں۔یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ خدا اسی کی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ کرتا ہے۔مذکورہ نظم میں شاعر اپنی قوم کے جوانوں کو غفلت کی نیند سے جگانا چاہتے ہیں۔

سوال: اس قطعہ کا خلاصہ اپنی زبان میں پیش کیجئے۔

جواب: اکبر نے اپنے اس خوبصورت قطعہ میں مسلمانوں کی غفلت اندیشی اور بے عمل پر طنز کے تیر چلائے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میری قوم کی حالت اس قدر بگڑ چکی ہے کہ اب اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے کیونکہ ان میں نہ محنت ومشقت کا جذبہ ہے اور نہ تلاش وجستجو کا جنون۔وہ فضول قسم کی باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔شاعر نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کیلئے وعظ ونصیحت کے بجائے ایک فرضی لطیفہ پیش کرکے اپنی قوم کی آنکھوں پر پڑا ہوا غفلت کا پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے۔چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن لیلیٰ کی ماں نے مجنوں سے کہا۔بیٹا اگر تو تعلیم کی طرف رجوع ہوکر ایم اے کرلے تو میں اُسی وقت لیلیٰ کی شادی تم سے کردوں گی۔اس بات سے میاں مجنوں کو بہت غصہ آیا اور لیلیٰ کی ماں کو جواب دیا کہ وہ سچا عاشق ہے اس کے دل میں صرف لیلیٰ بسی ہے۔وہ کوئی چرن داس نہیں جو کتابوں سے عشق کرے اور اگر لیلیٰ کو حاصل کرنے کی یہی شرط ہے کہ میں تعلیم حاصل کروں اور ایم اے کرلوں تو میں ایسے عشق سے باز آیا۔مجھے ایسی لیلیٰ منظور نہیں جس کے لیے ایم اے پاس کرنا پڑے۔

مولانا الطاف حسین حالیؔ

حالاتِ زندگی: اُردو ادب کی تاریخ میں حالیؔ کو اونچا مقام حاصل ہے۔وہ چوٹی کے شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔وہ اُردو تنقید کے بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ سوانح نگار کی حیثیت سے بھی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔نام الطاف حسین تخلص حالیؔ۔آپ ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلّہ انصار میں پیدا ہوئے۔چار برس کی عمر میں قرآن شریف کی تعلیم شروع کی۔ابھی نو سال کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والد چل بسے۔کچھ عرصے بعد والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔اس لئے تعلیم اور نگرانی کا فرض بڑی بہن اور بھائی نے ادا کیا۔ابھی اُن کی عمر سترہ برس کی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کی شادی ہو گئی۔علم حاصل کرنے کا شوق اس قدر تھا کہ چپ چاپ دہلی جا پہنچے۔وہاں ہزار طرح کی مصیبتیں اُٹھائیں لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔یہاں نواب شیفتہؔ سے شناسائی ہوئی جن کے توسط سے غالبؔ سے ملاقات ہوئی اور اُن کے شاگرد ہوئے۔غالبؔ کی وفات کے بعد لاہور چلے آئے جہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں نوکری مل گئی۔یہاں محمد حسین آزاد کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔اس کے بعد حالیؔ کو سرسید نے علی گڑھ بُلا لیا اور سرسید کے ساتھ کام کرنے لگے۔اُسی زمانے میں آپ نے مشہور مسدس مدوجزر اسلام لکھا۔آپ نے ۱۹۱۴ء میں پانی پت میں وفات پائی۔

خصوصیاتِ کلام: حالیؔ نے شاعری کو ایک نئی راہ دکھائی۔انہوں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اس وقت قوم کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے انھوں نے وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اُردو شاعری کو ایک نئی منزل سے آشنا کیا۔انھوں نے اُردو شاعری کو حسن و عشق کے پرستانوں سے نکال کر زندگی کے قریب لا کھڑا کر دیا اور نیچرل شاعری کا تصور پیش کیا۔اُن کی مشہور تصانیف میں حیات سعدیؔ، حیاتِ جاوید، یادگارِ غالبؔ، مقدمہ شعروشاعری، مسدس مدوجزر اسلام قابل ذکر ہیں۔حالیؔ کی نثر ہو یا نظم، سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ توانا اور پر تاثیر ہے۔مختصر یہ کہ سرسید کے بعد اگر اردو شعر و ادب پر کسی کا بہت بڑا احسان ہے تو وہ مولانا حالیؔ ہے۔حالیؔ کی تصنیفات کی فہرست حسبِ ذیل ہے:۔

حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، مقدمہ شعروشاعری، مقالاتِ حالیؔ، مسدس حالیؔ، مرثیۂ غالبؔ، شکوۂ ہند، دیوانِ حالیؔ، مجموعۂ نظم حالیؔ، مناجاتِ بیوہ، چپ کی داد، مجموعۂ نظم فارسی، علمِ طبقات الارض، مجلس النساء، گریاں مسموم۔

سوال: مولانا حالیؔ کی نظم ''خودستائی'' کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

جواب: ''خودستائی'' مولانا الطاف حسین حالیؔ کی لکھی ہوئی ایک نمائندہ نظم ہے۔خودستائی کے معنی اپنی تعریف کرنے کے ہوتے ہیں۔اپنے منہ اپنی تعریف کرنا کسی بھی انسان کو زیب نہیں دیتا ہے مگر حالیؔ کے مطابق ہر شخص کسی نہ کسی طرح سے اپنی تعریفیں کر کے اپنی ذات کو دوسروں سے افضل و اعلیٰ سمجھتا ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا ڈھنگ سب کا الگ الگ ہوتا ہے۔بیوقوف اپنی تعریفیں صاف صاف کرتے پھرتے ہیں جب کہ جو لوگ عقل مند ہوتے ہیں وہ یہی کام چپ چاپ اور گھما پھرا کے کرتے رہتے ہیں۔کوئی نرم دل اور سخی ہونے کی تعریف ڈھکے چھپے انداز میں اس طرح کرتا ہے کہ دیکھئے آج غلطی سے اپنا کمبل میں نے ایک بھکاری کو دے دیا ہے۔تو کوئی اپنی عقل مندی یوں ظاہر کرتا ہے کہ میں نے بھکاری کا چھپایا ہوا مال ظاہر کر دیا ہے۔کچھ لوگ خواہ مخواہ اپنے اہلِ وطن کی تعریفوں کے پُل باندھتے ہیں تاکہ اپنی بڑھائی بھی ساتھ میں ظاہر کر سکیں۔کوئی صاف گوئی ظاہر کرنے کے لئے اپنی قصیدہ خوانی کرتا۔اسی طرح سے کوئی تعریف کرتا ہے تو کوئی تعریف سن کے خوش ہوتا ہے۔ایسے ہی کچھ لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھال کر در پردہ اپنی اپنی بڑھائی بیان کرتے پھرتے ہیں۔حالیؔ خودستائی کے مختلف طریقوں پر سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ایک انسان میں اپنی تعریفیں کرنے کی یہ بُری عادت نہیں ہوتی تو عین ممکن تھا کہ دنیا میں غیبت جیسی بُری چیز بھی موجود نہیں ہوتی اور ایک انسان تعریفوں کے پردے میں اپنے عیب لاکھ چھپانے کی کوشش کرے، ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔مگر ایک انسان کی بے وقوفی کا عالم دیکھئے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بن کے ہمیشہ اپنے نقصان کا باعث بنتا ہے۔

پنڈت برج نارائن چکبست

حالاتِ زندگی: پنڈت برج نارائن چکبست کے بزرگ کشمیری پنڈت تھے اور لکھنؤ ہجرت کر گئے تھے مگر چکبستؔ کی پیدائش فیض آباد میں 1882ء میں ہوئی تھی۔ انہوں نے لکھنؤ میں تعلیم پائی اور کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایل۔ ایل بی کا امتحان پاس کیا اور وکالت کرتے رہے۔ ان کا شمار لکھنؤ کے بڑے اور مشہور وکلاء میں ہوتا تھا۔ بالآخر چکبست کا انتقال تقریباً پنتالیس سال کی عمر میں 1926ء میں ہوا۔

خصوصیاتِ کلام: چکبستؔ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ آپ نے غزلیں بھی بہت خوب کہی ہیں مگر آپ کی خاصیت آپ کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ آپ کے کلام میں لب و لہجے کی متانت، موضوعات کی سنجیدگی، معلومات کی وسعت اور زبان کی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ شاعری کے علاوہ چکبستؔ نے تنقید کے میدان میں بھی کام کیا ہے اور ان کے مجموعے کا نام ''مضامین چکبستؔ'' ہے جو عمدہ اور سنجیدہ تنقید میں اپنی مثال آپ ہے۔

سوال: ۔ نظم ''خاکِ ہند'' کا خلاصہ پیش کیجئے۔

جواب: ۔ نظم ''خاکِ ہند'' پنڈت برج نارائن چکبستؔ کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ یہ نظم وطن کی محبت کے جذبات سے سرشار ہو کے لکھی گئی ہے۔ چکبستؔ اس میں اپنے وطن ہندوستان کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہندوستان ایک عظیم الشان ملک ہے۔ اس کو قدرت نے طرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اس کے پانی کے خزانوں سے ایک عالم سیراب ہوتا رہا ہے۔ یہاں علم کی وہ روشنی رہی ہے جس نے دنیا جہاں کے اندھیروں کو ختم کر دیا ہے۔ اس ملک میں گوتم، سرمد اور اکبر جیسے لوگ ہوئے ہیں جنہوں نے اس کی عزت اور شان کو بڑھایا اور اس کو محبت اور بھائی چارے کا ایک بے مثال وطن بنا دیا ہے۔ یہاں ناقوس کی صداؤں اور اذان کی دلکش آوازوں سے فضائیں معمور رہتی ہیں۔ اس ملک کی زمین نہتائی زرخیز ہے اور یہاں جگہ جگہ خوشی سے جھومتے ناچتے نظر آتے ہیں۔ غرض یہ کہ ملک قدرتی وسائل، فطری مناظر اور اپنی عظیم تہذیب کی وراثت سنبھالے ہوئے ہے۔ مگر ساتھ ہی اس بات سے دل کو کافی رنج ہوتا ہے کہ اس ملک کے باشندے اس سے اب وہ پہلی سی محبت نہیں کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا جوشِ محبت کا جذبہ گزرتے وقت کے ساتھ سرد پڑ چکا ہے اور وہ اپنے ملک کے تہذیبی ورثے پر فخر نہیں کرتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ اپنی تہذیبی وراثت سے لاعلمیت ہے۔ اسلئے اے حبِ الوطنی کے جذبے! اِس ملک کے باشندوں کو اس خوابِ غفلت سے پھر ایک ایک بار سنا دے تاکہ ان کی یہ مایوسی دور ہو۔ کاش مایوسی کی راکھ کے اس ڈھیر سے کوئی چنگاری ظاہر ہو جو ان اندھیروں کو روشن کر دے اور ہندوستان والے پھر ایک بار اپنے وطن سے پہلی سی محبت کرنے لگ جائیں۔

اسرار الحق مجاز

حالاتِ زندگی: اسرار الحق مجازؔ کی پیدائش 1909ء میں رودلی ضلع بارہ بنکی اتر پردیش میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے علی گڑھ آئے۔ 1936ء میں مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ شعر و شاعری کا شوق انہیں بچپن سے ہی تھا اور علی گڑھ کی رومانی فضاؤں میں اس شوق کو مزید

بڑھا وااملا اورانہوں نے شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا۔اسی زمانے میں ترقی پسند تحریک ہندوستان میں اپنے قدم جمارہی تھی۔مجازؔ اس سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے ہم نوا بن گئے۔مجازؔ کئی عہدوں پر فائز رہے۔آل انڈیا

ریڈیو دہلی، محکمۂ اطلاعات ممبئی کے ساتھ منسلک رہے اور آخر کار ہارڈنگ لائبریری دہلی سے منسلک رہے۔مجاز کا انتقال 1955 ءمیں ہوا۔

مجازؔ تعلیم مکمل کر کے عملی دنیا میں قدم رکھتے ہی اپنے ارد گرد مستقبل سے مایوس اور بے روزگار جوانوں کا ہجوم دیکھا۔انہیں ان کے تمام مسائل کا حل ترقی پسند تحریک میں نظر آیا۔وہ اس تحریک کے ساتھ جڑ گئے اور اپنی آتشیں نظموں سے جوش وجذبہ ابھارنے اور ہمت وجرأت پیدا کرنے کے سامان کرنے لگے۔مجازؔ ہنگامی موضوعات اور مسائل کو موضوع بنانے کے علاوہ انسانی جذبات کی بھی خوب عکاسی کی ہے۔ان کی رومانی نظموں میں فنی بصیرت انسانی فطرت کی آگہی اور ایک خاص قسم کی دلکشی پائی جاتی ہے۔ان کی نظموں میں ''رات اور ریل''، ''آوارہ'' اور ''اندھی رات کا مسافر'' کافی مشہور ہوئی ہیں۔ان کے کلام کے مجموعے ''آہنگ''، ''شبِ تاب'' اور ''سازِنو'' کے نام سے منظرِ عام پر آئے۔

سوال:۔نظم ''رات اور ریل'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کیجئے۔

جواب:۔نظم ''رات اور ریل'' اسرالحق مجازؔ کی چند مشہور نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔یہ نظم اپنی تشبیہات اور استعاراتی نظام کی وجہ سے ایک لاجواب نظم ہے۔اس نظم میں ''رات'' زندگی کی راہوں کی دشواریوں، اندوہناکیوں اور محرومیوں کی علامت ہے اور ''ریل'' جوش وجذبہ، ہمت، حوصلہ، قوت اور کچھ کر جانے کے جرائت مندانہ قدم کی علامت بن کے سامنے آجاتی ہے۔مجازؔ ریل کے اسٹیشن سے چل نکلنے کے منظر کو خوب صورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔کہتے ہیں کہ ریل اپنے اسٹیشن سے آدھی رات کے وقت لہرا کے چل پڑی ہے۔اس نے کوئی ترانہ چھیڑ رکھا ہے جس کو یہ مدہم لہجے میں گاتی چلی جارہی ہے۔اس کی راہوں میں کہیں وادیاں آتی ہیں تو کہیں اس کو پہاڑوں کے دامن کو چھوتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔یہ سیٹی بجاتی، جھومتی کھیلتی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔اس کی رفتار آہستہ آہستہ سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔اپنی پٹریوں پر یہ جھومتی، لہراتی بل کھاتی اور ہزاروں پیچ وخم کھاتی رات کے اندھیروں کا اور اس کی خاموشیوں کا سینہ چیرتی ہوئی گزرتی چلی جاتی ہے۔اس کی روشنیاں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی شاہی برات اپنی پوری شان کے ساتھ آگے بڑھتی جارہی ہو۔یہ ریل میدانوں سے گزرتے ہوئے ایک بگولہ لگتی ہے اور جنگلوں کے بیچ ایک تیز آندھی کی طرح گزر جاتی ہے۔اس کو بس اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہنے کی ایک دُھن ہے۔یہ قوت اور جرأت کا ایک زبردست پیکر بن کر ہر ایک ناموافق کو موافق بناتی چلی جارہی ہے اور ہر ایک دشواری کو للکارتی جاتی ہے۔اس کی نگاہوں میں وادیوں کی گہرائی، پہاڑوں کی بلندی، ہواؤں کی رفتار، دھوپ کی تیزی، رات کا سناٹا اور اندھیرا، راہوں کی دشواری اور منزلوں کی دوری کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔یہ عزم اور ہمت کا مجسمہ بن کر ہر چیز کو قابو کرتی ہوئی بڑھتی چلی جاتی اور ایک انسان کو ہمت اور حوصلہ اور جوش اور جذبہ کے بل پر زندگی کی دشواریوں کو آسانیوں میں بدل دینے کے طریقے سکھاتی جاتی ہے۔

محاکمہ:۔

اس اکائی میں پہلے نظم کی صنفی شناخت کو واضح کیا گیا اور بتایا گیا کہ نظم کی کوئی مخصوص شکل وصورت نہیں ہوتی اور اس کے اندر فکر و خیال کا تسلسل اور اشعار میں آپسی ربط ضروری ہے۔اس کے علاوہ اردو نظم کے مختلف ادوار کو موضوع بحث بنایا گیا جس میں انجمنِ پنجاب اور مختلف نظم گو شعرا کی تاریخی اہمیت کا خصوصی تذکرہ کیا گیا۔آخر میں نظم گو شعرا اور ان کی نظموں سے متعلق بھی بحث ہوئی۔خود جانچنے کے سوالات بھی دیئے گئے ہیں اور مشکل الفاظ کے معنی بھی فرہنگ میں پیش کئے گئے ہیں۔مطالعاتی مواد کو تیار کرنے کے دوران جن ماخذات سے مدد لی گئی ہے اُن کا حوالہ بھی نیچے دیا گیا ہے۔

جانچ

۱ ۔ نظم کے لغوی معنی کیا ہیں؟

۲۔ کیا نظم میں تسلسل اور ربط ہوتا ہے؟

۳۔ کیا نظم کی کوئی مخصوص ہیئت ہوتی ہے؟

۴۔ نظم کی تین ہیئتوں کے نام بتائے؟

۵۔ مسمط کسے کہتے ہیں؟

۶۔ مخمس سے کیا مراد ہے؟

۷۔ مسدس میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟

۸۔ ترکیب بند نظم کی کون سی فارم ہے؟

۹۔ اردو میں نظم گوئی کا آغاز کب ہوا؟

۱۰۔ دس مشہور نظموں کے نام لکھئیں۔

کتابیات

۱۔ تاریخ ادب اردو — پروفیسر نور الحسن نقوی

۲۔ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر سنبل نگار

۳۔ اردو اصناف کی تدریس — اومکار کول، مسعود سراج

۴۔ بیسویں صدی میں اردو ادب — گوپی چند نارنگ

۵۔ مطالعہ اصناف ادب — شاہ فیصل

انجمنِ پنجاب (نئی نظم کی تحریک)

تمہید :

اردو ادب میں نظم نگاری کا رواج اس کے ابتدائی دور میں ہی شروع ہوا۔خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، سنت کبیر، امیر خسرو وغیرہ کے یہاں نظم نگاری کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ پابند نظم کی حقیقی ترقی نذیر اکبر آبادی کے ہاتھوں ہوئی۔ اکبر آلہ آبادی کی نظمیں بھی اردو نظم نگاری کی روایت میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔لیکن اردو نظم نے اصلی ترقی نئی نظم کی تحریک شروع ہونے کے بعد ہی کی۔ یہ تحریک انجمنِ پنجاب کے بینر تلے محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے ساتھ مل کر شروع کی۔ اس تحریک نے اردو نظم کو موضوع اور معیار کے اعتبار سے وسعت عطا کر کے اس کے دامن کو مالا مال کر دیا۔اس اکائی میں ہم اسی تحریک کی کاوشوں اور خدمات کا تذکرہ کریں گے۔

مقاصد :

اس اکائی کو پڑھنے کے درجِ ذیل مقاصد ہوں گے۔

۱۔ طالبِ علم انجمن پنجاب کی خدمات کی جانکاری حاصل کر سکیں۔

۲۔ طلاب نئی نظم کی تحریک سے واقف ہو سکے۔

۳۔ طالبِ علم اردو میں نظم نگاری کی روایت کا احاطہ کر سکیں۔

آموزشی ماحصل:

۱۔ طالبِ علم نظموں کو پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔

۲۔ طالبِ علم نئی نظموں پر بات کرتے ہیں۔

۳۔ طلاب نظموں کا خلاصہ لکھتے ہیں۔

۴۔ طالب علم نظم کی مختلف ہیئتوں کو سمجھتے ہیں۔

۵۔ طالب علم جدید نظم نگاری کی واقفیت رکھتے ہیں۔

اصل موضوع:

انجمنِ پنجاب کا پسِ منظر:

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد پورا ہندوستان ایک تعطل کا شکار ہو گیا۔سماجی، معاشی، سیاسی، علمی اور ادبی سطح پر پورا ملک زوال کی اور بڑھ رہا تھا۔اس تعطل کو دور کرنے کے لئے انگریز سرکار نے بھی کوششیں شروع کیں۔ان ہی کوششوں کے سلسلے میں ملک کے مختلف حصوں میں انجمنیں قائم کی گئی۔ایسی ہی ایک انجمن ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو قائم کی گئی۔اس انجمن کا نام ''انجمنِ اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب'' رکھا گیا۔لیکن بعد میں یہ ''انجمنِ پنجاب'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

انجمن کا ارتقاء:

یہ انجمن ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو قائم کی گئی۔ لاہور کالج کے پرنسپل ڈبلیو۔جی لائٹس کو اس انجمن کا صدر مقرر کیا گیا۔اس انجمن کے زیرِ اہتمام سیاسی،

سماجی، اصلاحی اور تہذیبی نوعیت کے مقالے اور مضامین پڑھنے کی مجالس کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ محمد حسین آزاد کو لائٹس نے انجمن کا لیکچرر مقرر کیا۔ اس کے ذمہ اگرچہ پہلے انجمن کی نشستوں میں لیکچر پیش کرنا، اُن لیکچرس کو درست کرنا اور پھر اُن کی اشاعت کا کام تھا لیکن بعد میں اس تحریک کے روحِ رواں ہی بن گئے۔ اس انجمن کا ترجمان رسالہ ''انجمن اشاعتِ مطالب'' آزاد کی ہی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔

انجمن کے مقاصد:

اس انجمن کے درجِ ذیل مقاصد تھے۔

۱۔ قدیم علوم کا احیاء

۲۔ صنعت وتجارت کا فروغ

۳۔ دیسی یعنی اردو زبان کے ذریعے علومِ مفیدہ کی اشاعت

۴۔ علمی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی مائل پر بحث ونظر

۵۔ انگریز حکومت اور عوام کے درمیان بدگمانی دور کرنے کے لئے صوبے کے بارسوخ افراد اور انگریز افسران کے درمیان رابطہ قائم کرنا۔

اس مقاصد کی حصولیابی کے لئے انجمن کے بینر تلے ایک ہمہ جہت پروگرام شروع کیا گیا۔ اس پروگرام کے تحت مختلف مقامات پر مدرسے اور کتب خانے قائم کرنے کے منصوبے بنائے گئے۔ رسائل جاری کئے گئے۔ سماجی، تہذیبی، اخلاقی، انتظامی اور ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے مختلف مجالس کا اہتمام کیا گیا۔

نئی نظم کی تحریک:

اس انجمن کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ اس کے مشاعرے مانے جاتے ہیں۔ دراصل ان ہی مشاعروں میں اردو ادب میں نئی نظم کی تحریک شروع ہوئی۔ جب اردو زبان کو انگریزوں نے ہندوستان کے مدارس میں پڑھانے کا فیصلہ کیا، اُس وقت کرنل ہالرائڈ پنجاب کے ناظمِ تعلیم تھے۔ اُن کو لگا کہ اسکولوں میں پڑھانے کے لئے اردو زبان میں نظموں کا وسیلہ بہت ہی محدود ہے۔ اس لئے انہوں نے محمد حسین آزادؔ کو موضوعی شاعری لکھنے کی ترغیب دی۔ یہ نظمیں لکھنے کے لئے انجمن لگاتار مشاعروں کا اہتمام کرتی تھی۔ ان مشاعروں میں شعراء کو کلام لکھنے کے لئے انجمن کی طرف سے ہی موضوعات دئے جاتے تھے۔ شعراء ان موضوعات پر نظمیں لکھ کر لاتے اور مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ ان مشاعروں کے چرچے دور دور تک پھیل گئے۔ انجمن کے زیرِ اہتمام کئی مشاعرے منعقد ہوئے۔ ان مشاعروں نے اردو نظم کو ایک نئی جہت اور سمت عطا کی۔ ان ہی مشاعروں کے ذریعے نیچرل شاعر لکھنے کا رواج بھی پروان چڑھا۔ اسی دور میں سرسید بھی فطری ادب کی تخلیق پر زور دیتے تھے اور انجمن نے بھی فطری شاعری کی وکالت کی جس سے اردو میں فطری شاعری کا ایک تابناک دور شروع ہوا۔

انجمنِ پنجاب کے مشاعروں میں محمد حسین آزادؔ اور مولانا حالیؔ نے نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی بعد میں اسماعیل میرٹھیؔ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ اردو نظم میں جو نئی چیزیں اس تحریک کی بدولت جگہ پا گئی اُن کی تفصیل درجِ ذیل ہیں:

۱۔ مناظرِ قدرت کا بیان:

مناظر قدرت کا بیان اگرچہ اردو نظم میں اس تحریک سے پہلے نظیرا کبرآبادی کی نظموں میں جابجا ملتا ہے۔ لیکن ان کو اس تحریک سے پہلے کوئی مستقل حیثیت نظم میں حاصل نہیں تھی۔ انجمن نے مناظرِ قدرت کے بیان کو ایک مستقل صورت دی اور اس کا سب سے پہلا نمونہ حالیؔ کی نظم ''برکھارت''

ہے۔اُن کے بعد آزاد نے ''ابرِ کرم'' لکھ کر اس نئی روایت میں جان ڈال دی۔ بعد میں اسماعیل میرٹھی، شوخ قدوائی اور بے نظیر نے مناظرِ فطرت کو اپنی نظموں بھرپور انداز میں پیش کیا۔

۲۔ حبِ وطن:

وطن سے محبت کے جذبات قدیم اردو شاعری میں محدود پیمانے پر ہی ملتے ہیں۔ حبِ وطن کے موضوع کو انجمنِ پنجاب سے وابستہ شاعروں نے ہی کھلے طور پر برتا۔ اس قسم کے موضوعات کا شاعری میں برملا استعمال اسی انجمن کا مرہونِ منت ہے۔ اس موضوع پر آزاد اور حالی پہلے نظمیں لکھیں، بعد میں چکبست، اقبال اور سرور جہاں آبادی نے اس موضوع کو تقویت بخشی۔

۳۔ اخلاقی شاعری:

اردو شاعری کا آغاز ہی اصل میں اخلاقی مضامین سے ہوا ہے اور اس کا چلن ہمیشہ سے رہا ہے۔ مگر اخلاقیات کو ایک باقاعدہ شعری موضوع بنانے کا سہرا بھی اسی تحریک کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے سماجی حالات کے پیشِ نظر اس تحریک نے شاعری کے ذریعے اخلاقیات کا درس دیا۔ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے اس نوعیت کی شاعری کو اہمیت دی۔ حالی کی نظم ''مسدسِ مد و جزرِ اسلام'' اس ضمن میں ایک اہم نظم ہے۔ اس کے بعد اقبال اور دوسرے شعراء اس روایت کو آگے بڑھایا۔

محاکمه :

انجمنِ پنجاب نے ایک قلیل عرصے کے دوران اردو شاعری میں بالعموم اور اردو نظم بالخصوص انقلاب افزاء تبدیلی لائی۔ اس تحریک کے زیرِ اہتمام ۲۹ مئی ۱۸۷۴ء کو پہلا مشاعرہ منعقد ہوا۔ جبکہ آخری مشاعرہ ۳ مارچ ۱۸۷۵ء کو منعقد کیا گیا۔ انجمن کے کل ملا کر ۹ مشاعر ہوئے۔ ان نو مشاعروں نے ہی اردو نظم کی کایا پلٹ دی۔ مختصراً اس تحریک نے اردو ادب کی قابلِ قدر خدمت انجام دی۔

جانچ:

درجِ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھئے:

۱۔ انجمنِ پنجاب کا اصلی نام کیا ہے؟

۲۔ انجمنِ پنجاب کے صدر کا نام بتائے؟

۳۔ اس انجمن کا اصلی کا کام کیا تھا؟

۴۔ انجمن کا پہلا مشاعرہ کب ہوا؟

۵۔ محمد حسین آزاد انجمن میں کس عہدے پر تھے؟

کتابیات:

۱۔ اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ — سنبل نگار

۲۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ — انور سدید

۳۔ اردو شاعری کا فنی ارتقاء — ڈاکٹر فرمان فتحپوری

اردو مثنوی : تعارف اور صنفی خصوصیات

تمہید

مثنوی اردو شاعری کی اہم صنف ہے۔اس صنف میں غزل کی رعنائیاں بھی ہیں اور قصیدہ کی شان وشوکت بھی، رندان بلانوش کی ہائے ہو کے نعرے بھی ہیں تو صوفیوں کی اللہ اکبر کی صداؤں کے ساتھ حسن وعشق کی داستانیں بھی ہیں،غرض کون سا راگ ہے جو مثنوی کے ساز پر نہیں گایا گیا ہو۔

مثنوی انسانی زندگی کے اعمال وکردار پر روشنی ڈالتی ہے نیز واقعات کے تسلسل کے ساتھ ارادوں کی کشمکش اور حرکات واعمال کی جدوجہد بھی اس صنف میں نظر آتی ہے۔

مقاصد

اس اکائی میں مثنوی کی اہمیت، افادیت، تعریف، فن اور آغاز وارتقا کے ساتھ میرحسنؔ کی مثنوی نگاری اور ''سحرالبیان'' کی خصوصیات سے واقف کرایا گیا ہے۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ:

☆ مثنوی کی تعریف اوراس کے فن کو سمجھا سکیں گے۔

☆ مثنوی کی خصوصیات واضح کرسکیں گے۔

☆ مثنوی کی تاریخ سے واقف کرا سکیں گے۔

☆ مثنوی سحرالبیان کی فنی وادبی خصوصیات بیان کرسکیں گے۔

☆ میرحسن کی ادبی خدمات اور حیات کا احاطہ کرسکیں گے۔

آموزشی ماحصل

۱۔ طلباءشعری اصناف کی پہچان رکھتے ہیں۔

۲۔ طلباءمثنویاں پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

۳۔ طلباءمثنوی کی تعریف اورتاریخ جانتے ہیں۔

۴۔ طلباءاُردو کی شہکار مثنویوں کی جانکاری رکھتے ہیں۔

۵۔ طلباءمیرحسن کا تعارف اورادبی کارناموں کی جانکاری رکھتے ہیں۔

۶۔ طلباءمثنوی سحرالبیان کی خصوصیات سے واقف ہیں۔

مثنوی کی تعریف اوراس کافن

شعری اصناف میں مثنوی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔مولانا حالیؔ نے اسے سب سے کارآمد صنفِ سخن قرار دیا ہے۔مثنوی عربی زبان کے لفظ ''مثنیٰ'' سے مشتق ہے جس کے معنی دو دو یا دو جُز والی چیز یا دوہرا کرنا ہیں۔۔اصطلاح میں مثنوی اُس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ وہم ردیف ہوں۔مگر ہر شعر کا قافیہ مختلف ہو۔مثنوی بے حد مختصر بھی ہوسکتی ہے اور نہایت طویل بھی۔اس کا آرٹ بیانیہ اور توضیحی ہوتا ہے۔مثنوی کا فن

بہت کچھ ناول سے ملتا جلتا ہے۔مثنوی کے لیےضروری ہے کہ اس کا پلاٹ مربوط اور گتھا ہوا ہو۔واقعات منطقی طور پر آگے بڑھیں ۔ قصے میں آغاز، وسط اور انتہا موجود ہو۔علامہ شبلی نے مثنوی کے لیے حسنِ ترتیب، کردار نگاری اور واقعہ نگاری کو ضروری ٹھہرایا ہے۔مثنوی کے لیے سات اوزان مقرر ہیں۔مثنوی اس طویل نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی واقعہ تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔

مثنوی کی خصوصیات

۱) **تسلسل اور ترتیب:** مثنوی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تسلسل اور ترتیب ہوتا کہ سارے واقعات اور پوری داستان مکمل طور پر ذہن میں آسکے۔

۲) **واقعہ نگاری:** مثنوی میں واقعہ نگاری کے تمام اصولوں کی پابندی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔یعنی واقعے کی تمام اصلی خصوصیات دکھائی جائیں اور معمولی باتوں کو بھی واضح اور نمایاں کیا جائے۔

۳) **کردار نگاری:** مثنوی میں کرداروں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ان مختلف کرداروں کے اخلاق،طرز زندگی،مزاج، گفتگو اور رہن سہن کی تمام امتیازی خصوصیات کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

٤) **اسلوبِ بیان:** مثنوی کی کہانی کتنی ہی دلچسپ اور پسندیدہ کیوں نہ ہو،اگر سلیقہ کے ساتھ اس کو بیان نہ کیا جائے تو سب بیکار رہے۔ کیونکہ مثنوی کا دارومدار بیان وزبان اور خوب صورت اسلوب پر ہوتا ہے۔

مثنوی کے اجزائے ترکیبی

آیئے اب ہم مطالعہ کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ مثنوی کے اجزاء یا عناصر کیا ہیں؟

۱۔ حمد ونعت

۲۔ مدح فرمانروائے وقت

۳۔ تعریفِ شعروسخن

۴۔ قصہ یا اصل موضوع

۵۔ خاتمہ

مثنوی کی ابتداء حمد ونعت سے کی جاتی ہے اس میں اپنے رب کی تعریف اور رسول پاک ﷺ کی نعت بیان کی جاتی ہے۔

مثنوی کا دوسرا جز مدح حاکم فرمانروائے وقت ہوتا ہے ان کی تعریف کرنا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ درباروں سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے لئے روزی روٹی کا مسئلہ ہوتا ہے اور حکمراں کی تعریف وسیلۂ روزگار تھا۔

مثنوی کے تیسرے حصے میں اپنی شاعری کی تعریف اور تعلّی کی جاتی ہے تاکہ اپنی شاعرانہ اہمیت کو ثابت کیا جا سکے۔

مثنوی کے چوتھے میں اصل قصے تسلسل کے ساتھ اصل قصے کو بیان کیا جاتا ہے۔

مثنوی کے پانچویں حصے میں قصے کا کلائمکس ہوتا ہے۔

مثنوی کی تاریخ

عربی میں مثنویاں نہیں لکھی گئی ہیں۔ جبکہ فارسی میں شاہنامہ فردوسی اور مثنوی مولانا روم جیسی بلند پایہ مثنویاں موجود ہیں۔ فارسی کی تقلید میں سب سے پہلے مثنوی دکن میں لکھی گئیں۔ اردو ادب کی مثنویوں میں فخر الدین نظامی کی مثنوی کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے جو انہوں نے ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے نام سے تصنیف کی۔ یہ مثنوی بہمنی خاندان کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ کے زمانے میں لکھی گئی۔ اسی دور کی ایک اور مثنوی اشرف بیابانی کی ''نوسر ہار'' جس کا موضوع کربلا کا واقعہ ہے۔ دیگر مثنویوں میں عبدلؔ کی ''ابراہیم نامہ''، ملاوجہی کی ''قطب مشتری''، ابنِ نشاطی کی ''پھول بن''نصرتی کی ''گلشنِ عشق''وغیرہ شامل ہیں۔

شمالی ہند میں جعفرزٹلی، فائز دہلوی، شاہ مبارک آبرو اور شاہ حاتم نے اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ کی مثنویات بھی اہم ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ دہلوی کی مثنوی ''خواب وخیال'' اسی زمانے میں لکھی گئی۔

میر حسنؔ کی ''سحر البیان''، پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی ''گلزارِ نسیم'' اور نواب مرزا شوقؔ کی ''زہرِ عشق'' اردو کی سب سے زیادہ مشہور مثنویاں ہیں۔ جو لکھنو میں لکھی گئی ہیں۔ آزادؔ اور حالیؔ نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی، علامہ اقبالؔ اور حفیظ جالندھری کی لکھی ہوئی مثنویاں کافی مقبول ہیں۔

سحرالبیان (میر حسنؔ)

شاعر کا تعارف

میر حسنؔ کا اصل نام غلام حسن ہے اور حسنؔ تخلص کرتے ہیں۔ ان کی پیدائش 1736ء میں دہلی میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد میر ضاحکؔ سے ہی حاصل کی۔ اپنی شعر گوئی کی ابتداء انہوں نے فارسی شاعری سے کی۔ ان کے اجداد شاہجہاں کے زمانے میں ہرات سے آکر دہلی میں آباد ہوئے۔ دہلی برباد ہوئی تو میر ضاحکؔ پہلے لکھنو پھر فیض آباد اور اس کے بعد دوبارہ لکھنو پہنچے۔ میر غلام حسنؔ بھی ہمراہ تھے۔ پہلے میر ضاحکؔ اور پھر سوداؔ سے کلام پر اصلاح لی۔ میر حسنؔ کی دو اہم تصانیف ہیں۔ ایک ''کلیاتِ میر حسنؔ'' اور دوسری ''تذکرہ شعرائے اُردو''۔ میر حسنؔ صرف پچاس سال زندہ رہے اور 1786ء میں اس جہاں سے کوچ کر گئے۔

میر حسنؔ ایک صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ ان کے دیوان میں غزلیں، ترکیب بند، مخمس، مرثیہ، واسوخت، مثلث، قصیدہ، رباعی غرض ہر صنفِ شعر موجود ہے۔ قصیدہ گوئی میں اگرچہ میر حسنؔ نے کوئی کمال حاصل نہ کیا لیکن ان کی غزل گوئی کا معیار صاف ستھرا اور بلند ہے۔ مثنوی نگاری میر حسنؔ کا خاص میدان ہے۔ انہوں نے تقریباً ایک درجن مثنویاں لکھی ہیں۔ مثنوی ''سحر البیان'' ان کا ایک شہکار ہے۔ یہ مثنوی اپنی بے شمار خوبیوں کی وجہ سے اپنا کوئی جواب نہیں رکھتی۔ اس مثنوی میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدرِ منیر کی داستانِ محبت ہے۔ مثنوی سحر البیان کا سن تصنیف ۸۵۔۸۴ کے اء تسلیم کیا جاتا ہے، میر حسن نے اپنی اس تصنیف پر بڑا فخر کیا ہے اور اپنی نام وری کا ذریعہ قرار دیا ہے کہ

رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام　　　　کہ ہے یادگارِ جہاں یہ کلام

مثنوی سحر البیان کی خصوصیات

مثنوی سحر البیان کی کہانی سیدھی اور سپاٹ ہے لیکن میر حسن نے ڈرامائی انداز اپنایا، اس کے علاوہ منظر نگاری اور جذبات نگاری کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ اس میں شاعر نے خیالی کرداروں کو لکھنو کے جاگیردارانہ نظام کے نواب زادوں کو حقیقی انداز میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور ان کے احساسات و جذبات نیز نفسیات کے بیان کا حق ادا کر دیا ہے۔

لکھنوکی تہذیب میں محفل کی آرائش پر خاصی توجہ دی جاتی تھی اورمثنوی سحرالبیان میں میرحسن نے اس کا خاص اہتمام کیا ہے، یہ مثنوی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں لکھنوکی تہذیب جلوہ گر ہے، اس میں سارے کردار چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان میں سے کچھ کردار تو زندہ جاوید ہوگئے ہیں جیسے نجم النساء کا کردار ایک متحرک اور فعال کردار ہے جوکہ ادب میں زندہ کردار ہے۔

جزئیات نگاری اس مثنوی کا نمایاں وصف ہے جذبات اور احساسات کا بیان بہت مفصل انداز میں کیا گیا ہے، مختلف فنون، صنعتوں اور پیشوں کی اصطلاحات مفصل بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً نجوم، موسیقی، رسم الخط، پھولوں، زیورات، سواریوں وغیرہ کی اصطلاحات کا بیان نہایت مفصل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مثنوی سحرالبیان کی شاہکاری اس کی سحرالبیانی کی وجہ سے ہے، الفاظ کی صنعت گری، رعایت لفظی، میرحسن کی طرز نگارش کا بہترین نمونہ ہے۔ میرحسن نے مثنوی سحرالبیان صاف اور بامحاورہ زبان میں تصنیف کی ہے جس کی وجہ سے اس کے کئی اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں مثلاً

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن

یہ مثنوی دہلی اور لکھنوکی تہذیب کا مشترکہ ورثہ کہلاتی ہے اس میں دلی جذبہ، سچائی اور تاثیر ہے ساتھ ہی ساتھ اس میں کاریگری اور صنعت پروری بھی ہے، میرحسن زبان کے ماہر تھے لکھنوی اور دہلوی زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی دہلی کی سادگی اور لکھنوکی پرکاری ان کی زبان کا امتیازی وصف ہے۔ بہر حال میرحسن نے سحرالبیان میں بیان پر توجہ مرکوز کی اور اسی لیے اس کا نام سحرالبیان رکھا ہے، اس مثنوی کی تصنیف کو تقریباً دوسو سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی زبان و بیان اور تہذیب و معاشرت کی عکاسی کے اعتبار سے یہ مثنوی بے مثل مانی جاتی ہے۔

سحرالبیان کا خلاصہ

مثنوی ''سحرالبیان'' میرحسنؔ کی ایک بے مثال مثنوی ہے۔ یہ قصہ بے نظیر اور بدرِ منیر کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس مثنوی کا شمار اُردو کی شہکار مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس مثنوی کو مروجہ اجزاء کی پابندی کے تحت حمد، نعت، منقبت اور فرمانروائے وقت کی تعریف کرتے ہوئے اپنی ناموری کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدرِ منیر کی داستانِ محبت ہے۔ شہزادے کا والد ایک بادشاہ تھا جس کے پاس دنیا کی ہر چیز اور ہر آرام تھا مگر وہ بے اولاد تھا۔ عمر بھر تڑپتے رہنے کے بعد بادشاہ کی مرادیں پوری ہوتی ہیں اور شہزادہ بے نظیر پیدا ہوتا ہے۔ مگر نجومیوں اور جوتشیوں کی پیش گوئی کے مطابق بے نظیر کی زندگی کو بارہ سال تک بلندی کے خطرے کا سامنا رہے گا۔ اسلئے بے نظیر کی پرورش بڑی احتیاط کے ساتھ کی گئی۔ یہاں تک کہ بارہ برس گزر گئے سارے ملک میں شادیانے بجائے گئے اور جشن کا سماں بندھ گیا۔ مگر بدقسمتی سے بارہ سال گزرنے میں ابھی ایک رات کا وقت باقی تھا۔ شہزادہ محل کی بلندی پر اس رات سویا ہوا تھا کہ اوپر سے ماہ رخ پری کا گزر ہوا۔ وہ اس پر عاشق ہوئی اور اس کو پلنگ کے ساتھ اڑا کر لے گئی۔ ہر طرف ماتم کی لہر دوڑ گئی۔ ایک دن پری سے نظریں چرا کر بے نظیر ایک باغ میں اترا جو شہزادی بدرِ منیر کا تھا۔ بے نظیر، بدرِ منیر کو دیکھتے ہی اس پر عاشق ہوا اور شہزادی نے بھی محبت قبول کی۔ ایک دیو نے یہ دیکھا اور ماہ رخ پری کو خبر کر دی۔ ماہ رح نے غصے میں آ کر بے نظیر کو ایک کنویں میں قید کیا۔ شہزادی کی سہیلی نجم النساء بھیس بدل کر اس کی تلاش میں نکلی۔ جنوں کے بادشاہ کا بیٹا فیروز شاہ، نجم النساء پر عاشق ہوا۔ نجم النساء نے بے نظیر کی دستیابی کی شرط لگا دی۔ جنوں کی کوششوں سے شہزادہ بے نظیر رہائی پا گیا اور اس کی شادی بدرِ منیر کے ساتھ ہوگئی اور نجم النساء جنوں کے بادشاہ کے بیٹے کے ساتھ شادی کر کے پرستان چلی گئی۔ اور اس طرح سب کی مرادیں پوری ہوئیں۔

محاکمہ

مثنوی ہیئت کے اعتبار سے بیانیہ نظم ہے، قافیہ کی گنجائش کے باعث اس میں تفصیل سے کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔اسی لیے اردو شعراء نے اس سے فائدہ اُٹھایا ہے اور طویل داستانوں کو مثنوی کا جامہ پہنایا ہے۔مثنویوں میں عشق ومحبت کے موضوع کے علاوہ عجیب وغریب واقعات اور فوق الفطری کردار، مذہب، اخلاق اور سماجی ومعاشی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے،مثنویوں میں خارجی ماحول حاوی نظر آتا ہے۔مثنویوں نے زبان وبیان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے اور زبان کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔اس اکائی میں مثنوی کے اجزاء اور مثنوی کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ ہم نے میر حسن کے حالات زندگی، مثنوی سحرالبیان کا اور اس کی شعری خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے۔

جانچ

۱۔ مثنوی کی تعریف بیان کیجئے۔

۲۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے۔

۳۔ دکن کی مشہور مثنویوں کے نام بتائے۔

۴۔ اُردو کی شہکار مثنویوں کے نام بتائے۔

۵۔ مثنوی کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی کیا ہے؟

۶۔ میر حسن کون تھے؟

۷۔ مثنوی سحرالبیان کے مرکزی کرداروں کے نام بتایئے۔

۸۔ شہزادے کو کتنے سال تک بلندی سے خطرہ ہے۔

معاون کتب

۱۔	اُردو مثنوی کا ارتقاء	پروفیسر سید عقیل رضوی
۲۔	مثنوی سحرالبیان	مرتبہ قمرالہدیٰ
۳۔	اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار
۴۔	تاریخِ ادب اردو	نورالحسن نقوی

حضرت شیخ نور الدینؒ ریشی

تمہید

کشمیر کو صوفی سنتوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔اس جنت نماز کرہ ارض نے بڑے بڑے ولیوں اور منیوں کو پیدا کیا ہے۔ مانا جات ہے کہ کشمیر میں ہی اسلامی ریشیت کا آغاز بھی ہوا ہے۔شیخ نور الدین ولیؒ کشمیر کے پہلے ریشی مانے جاتے ہیں۔انہوں نے اسلامی تصوف کو ایک نئی طرح دی۔وہ ایک جید شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے دانشور اور اسلامی مفکر بھی تھے۔انہوں ے اپنے کلام میں مسلمانانِ کشمیر کو خدا پرستی، انسان دوستی اور حق گوئی کا وہ درس دیا جس کی مثال ملنا محال ہے۔اُن کو کشمیری مسلمان شیخ العالمؒ، نندہ ریشی، علمدارِ کشمیر اور کئی دوسرے ناموں سے جانتے ہیں۔اُن کے کلام کو کشمیری قرآن کہا جاتا ہے۔کشمیر کے ہر گھر، مسجد اور خانقاہ میں اُن کے کلام کو عقیدت واحترام سے پڑھا جاتا ہے۔ان کے کلام کو دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔اردو میں اُن کے کلام کو کئی لوگوں نے ترجمہ کیا ہے جن میں نشاط انصاری بھی شامل ہیں۔اس اکائی میں ہم شیخ العالمؒ کے کلام اور اُن کی زندگی کے بارے میں آگہی فراہم کریں گے۔

مقاصد :

اس اکائی کے درجِ ذیل مقاصد ہوں گے۔

۱۔ شیخ العالم کی زندگی کے بارے میں جاننا

۲۔ شعری ترجموں کے فن کو سمجھنا۔

۳۔ شیخ العالم کے کلام کو پڑھنا اور سمجھنا اور اس کی تفہیم کرنا۔

آموزشی ما حصل:

۱۔ طلاب شیخ العالمؒ کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

۲۔ طلاب شیخ العالمؒ کے کلام پر بات کرتے ہیں۔

۳۔ طلاب شیخ العالمؒ کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں۔

۴۔ طلاب شیخ العالمؒ کے پیغام کو سمجھتے ہیں۔

۵۔ طلاب شعری ترجموں کو پرکھتے ہیں۔

حالاتِ زندگی: حضرت شیخ نورالدینؒ ریشی (۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۵ء) کولگام تحصیل کے کیموہ گاؤں میں تولد ہوئے تھے۔ والد کا نام شیخ سالار الدّین اور والدہ کا نام سدر تھا۔ والدین نے حضرت شیخ نورالدین کا نام نُند رکھا تھا۔ آپ کے خاندان کا تعلق کشتواڑ کے ہندو راجاؤں کے ساتھ بتایا جاتا ہے۔ حضرت نورالدینؒ کو بچپن سے دُنیا اور مال و دولت کے ساتھ دل نہیں لگتا تھا۔ آپ اکثر عبادتِ الٰہی میں ہی محو رہا کرتے تھے۔ کئی سال تک گوشہ نشینی کے بعد آپ نے کشمیر کے کئی علاقوں کی سیاحت کی۔ آپ نے کشمیر میں ریشی سلسلہ کی احیاء نو کر کے اسلامی ریشیت کی بنیاد ڈالی۔ شیخ العالمؒ اور آپ کے خلفا مختلف علاقوں میں اسلام، اخوت، بھائی چارے، انسان دوستی، سادگی، عبادتِ الٰہی اور رواداری کا پرچار کرتے تھے۔ حضرت شیخ نورالدینؒ کشمیر کے رشیوں کے پیشوا تھے۔ آپ ظلم و جبر اور استحصال کرنے والوں کے سخت خلاف تھے۔ کشمیر کے لوگ بلا لحاظ مذہب و ملت حضرت شیخ نورالدینؒ ریشی سے عقیدت رکھتے ہیں۔ آپ کو شیخ العالمؒ، علمدارِ کشمیرؒ اور سہزانند جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۸۴۲ ہجری مطابق ۱۴۳۸ء آپ کا سالِ وصال ہے۔ چرارِ شریف میں آپ کا مدفن لاکھوں لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہے۔ وہاں ہر سال موسم خزاں میں عُرس منایا جاتا ہے۔

خصوصیاتِ کلام: روحانی بُزرگ اور تمدن ساز شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت شیخ نورالدینؒ ریشی ایک اعلٰے پایہ کے شاعر بھی تھے۔ آپ کے بسیار اشعار اور اقوال روزمرہ زبان میں شامل ہوگئے ہیں۔ آپ کا مشہور قول ہے۔ اَن پوشہ تیلہ ییلہِ وَن پوشہ (خوراک ملتی رہے گی اگر جنگلات موجود رہیں)۔ آپ کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں۔ عرفِ عام میں اُن کے اشعار کو ''شُر کی'' کہا جاتا ہے۔ ایک شلوک میں عموماً چار مصرعے ہوتے ہیں۔

شلوکوں کی تشریح

حوالہ: درج ذیل اشعار حضرت شیخ نورالدینؒ ریشی کے لکھے ہوئے شلوک کے ہیں۔ اُن کے شلوکوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور عظمت کی تعریفیں، پیارے نبی ﷺ کی بے شمار مدح سرائی، اخلاقیات، عمل کا پیغام، انسان دوستی، پاکیزگی، سچ کی تلقین اور رواداری کا درس ملتا ہے۔

شلوک نمبر ۱: اس شلوک میں حضرت شیخ نورالدینؒ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے گنّے میں کھانڈ پیدا کر کے ایک معمولی سے پودے کو میٹھا بنا دیا ہے۔ اُس نے اپنی قدرت سے شہد کی مکھی میں شہد بھر کر ایک معمولی سے کیڑے کو بلند مرتبہ عطا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے کمال سے ٹیڑھی میڑھی انگور کی بیل کو میٹھے اور رس دار انگور کے گچھے عطا کر دیئے۔ شیخ العالمؒ فرماتے ہیں کہ اے اللہ آپ کی اس قدرت کے کمال کو دیکھ کر میں آپ کی ذات پر قربان ہوجاؤں۔ آپ نے اپنی قدرت سے ایک معمولی سے ہرن کو مُشک کی تھیلی عطا کی ہے جو عنبر کی خوشبو کی طرح خوشبودار ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی قدرت کے ہی کرشمے ہیں۔

شلوک نمبر ۲: اس شلوک میں حضرت شیخ نورالدینؒ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس دنیا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک لمحے کے لئے یہاں آتا ہے اور دوسرے لمحے میں یہاں سے واپس چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں آ کر انسان کا رشتہ صرف مٹی سے جڑا رہتا ہے کیونکہ یہی مٹی اُس کا اوڑھنا اور بچھونا بن جاتی ہے۔ اس مٹی میں مر کر اُس کو دفن کیا جاتا ہے۔ شیخ العالم انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اس میں شک نہیں ہے کہ انسان تو نے اس دنیا میں غفلت اور لاپروائی کر کے اپنے آرام اور آسائش کے اونچے اونچے مکان بنالیتا ہے لیکن کل جب تمہارے جسم سے روح پرواز کر جائے گی تو یہ عالیشان مکان تو کس کے لئے چھوڑ کر جائے گا۔

شلوک نمبر ۳: اس شلوک میں حضرت شیخ نورالدینؒ ایک تلخ حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے غافل انسان جب تو مرجائے تو تجھے زمین کے نیچے دفنایا جائے گا۔ وہاں کوئی بھی تمہارا ساتھی نہیں ہوگا۔ وہاں جو کچھ بھی تمہارے ساتھ پیش آئے گا تجھے وہ سب کچھ اکیلے ہی برداشت کرنا پڑے گا۔ اس اے غافل انسان تو وقت سے پہلے ہی توبہ کر کے اچھے اعمال کی طرف راغب ہوجا، تاکہ تو عذاب قبر سے محفوظ رہ سکے۔

شلوک نمبر ٤: اس شلوک میں حضرت شیخ العالمؒ مٹی کے اوصاف اور تاثیر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے انسان کو مٹی سے پیدا کر دیا ہے۔ اسی مٹی سے دنیا کے اندر انسانوں نے اپنے رہنے کے لئے گھر بنائے اور ساز وسان بھی تیار کر دیا۔ اس مٹی میں اللہ تعالیٰ ایسی تاثیر پیدا کر دی ہے کہ بے شمار نعمتیں اسی مٹی میں پیدا ہوتی ہیں۔ مٹی کے برتنوں میں ساری نعمتیں پکائی جاتی ہیں۔ جب انسان کے جسم سے روح نکل جائے گی تو انسان کے جسم کو مٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تو ایسے میں انسان کا خاکی جسم مٹی کے ساتھ ہمیشہ کے مل جائے گا۔

سوال: مرحوم نشاط انصاری کی شخصیت پر ایک نوٹ لکھئے۔

جواب: مرحوم نشاط انصاری (دلنہ بارہ مولہ، ولادت ۱۹۳۰ء............وفات ۲۰۰۰ء) جو کشمیری زبان کے اچھے شاعر و ادیب تھے اور اُردو فارسی زبان و ادب پر بھی دسترس رکھتے تھے، نے حضرت شیخ العالمؒ کے ۲۶۰ شلوکوں کا اُردو میں آزاد ترجمہ کیا ہے۔ اِس ترجمے کو ساہتیہ اکادمی دہلی نے ''سلسبیل'' عنوان کے تحت ۱۹۹۵ء میں کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ نشاط انصاری کو پروفیسر مجیب کی تحریر کردہ کتاب ''ذاکر حسین'' کو کشمیری میں ترجمہ کرنے کے لیے ۲۰۰۷ء میں ساہتیہ اکیڈیمی اعزاز سے نوازا گیا۔

سوال: حضرت شیخ العالمؒ کے چاروں شلوکوں کا مرکزی خیال ایک مختصر مضمون کی صورت میں لکھئے۔

جواب: حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین نورانیؒ کے شلوکوں میں عظیم پیغامات موجود ہیں۔ ان شلوکوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور عظمت کی تعریفیں، پیارے نبی ﷺ کی بے شمار مدح سرائی، اخلاقیات، عمل کا پیغام، انسان دوستی، پاکیزگی، سچ کی تلقین اور رواداری کا درس ملتا ہے۔ نصاب میں شامل چار شلوکوں کا مرکزی پیغام یہ کہ انسان غفلت اور لاپروئی سے پرہیز کر کے اپنی حقیقت کو سمجھ کر سچائی، دیانتداری اور پرہیزگاری کی طرف مائل ہوجائے اور اس فانی دنیا کی چاہت کو اپنے دل سے نکال کر نیک اعمال انجام دیتا رہے نیز دنیا و آخرت کو سنوارنے کے لئے خدا تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہ کر اُس کی بے شمار نعمتوں کا شکر کرتا رہے اور اپنی موت کو ہمیشہ یاد کرتا رہے۔

کتابیات

۱۔	کلیات شیخ العالمؒ	اسد اللہ آفاقی
۲۔	نورنامہ	غلام نبی گوہر
۳۔	عانہ خانہ	عزیز حاجنی